Title – Jo-E-Sher.
Creator – Anand Narain Mila.
Publisher – Naami Press (Lucknow)
Date – 1949
Pages – 392
Subjects – Urdu Shayari – Majmua Kalaam.

گرتوں کو تھامے جو وہ کفِ دستگیر لا
تقدیرِ شب میں صبح کی روشن لکیر لا
مرہم نہیں نظر میں تو نشتر زنی نہ کر
یا تیشہ لے نہ ہاتھ میں یا "جوئے شیر" لا

آنند نرائن ملا

دسمبر ۱۹۴۹ء

قیمت پانچ روپے علاوہ محصول

شعر

کھینچتی ہے زندگی احساس شاعر پر نقوش

پھوٹتی ہیں جن سے کرنیں ذہن و دل میں پے بہ پے

نطق اُڑا لیتا ہے ان کرنوں کا اک دھندلا سا عکس

اور انھیں پرچھائیوں کا نام ملا شعر ہے

انتساب

مٹتی ہوئی اردو کے نام

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ

یہ سانحہ سالِ چہل و نو (۴۹) میں ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اُردو کا گلا
اُردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
ملّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

فہرست

(آل احمد سرور)

آنند نرائن ملّا کی شاعری نئے لکھنؤ کی آواز ہے۔ یہ نیا لکھنؤ پُرانے لکھنؤ سے بھی متاثر ہوا ہے، مگر بیسویں صدی کی روح کا اثر اس نے زیادہ قبول کیا ہے۔ لکھنؤ کی پرانی شاعری فن کی پرستار تھی، یہ نئی شاعری جذبات کے اظہار پر زور دیتی ہے مگر فن کی روایات کو نظرانداز نہیں کرتی لکھنؤ کی پرانی شاعری وزن و وقار رکھتی ہے مگر اس میں جذبہ کی تھرتھراہٹ اور احساس کی تازگی کم ہے، اس نئی شاعری نے بیسویں صدی کی زندگی سے نیا احساس لیا ہے اور فن کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔

لکھنؤ جس تہذیب کا گہوارہ ہے وہ بعض لوگوں کے نزدیک مٹ چکی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف بدلی ہے۔ لکھنؤ کے تمدن کے نقش و نگار جاگیردارانہ تہذیب سے بنے تھے۔ سرمایہ داری کے اس دور میں بھی جاگیردارانہ تہذیب غزل اور رندی میں چھپ چھپ کر ظاہر ہوتی رہی، مگر انیسؔ سے لے کر چکبستؔ تک مسدس کی مقبولیت کچھ اور بھی کہتی ہے۔ انیسؔ کے نیم مذہبی نیم تہذیبی مرثیے، چکبستؔ کے نیم قومی اور نیم سیاسی مرقعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ لکھنؤ میں رندی اور رنگینی کے علاوہ کچھ انسانی اور اخلاقی قدریں بھی مقبول رہیں۔ لکھنؤ کی شاعری میں لاکھ خرابیاں سہی، مگر لکھنؤ میں اُردو زبان و ادب کو تقریباً دو سو سال کی مسلسل زندگی ملی ہے، اس نے یہاں کے رہنے والوں کے مزاج میں ایک لطافت و شائستگی پیدا کر دی ہے۔ اس لطافت و شائستگی کا ہم کتنا ہی مذاق اُڑائیں مگر ہماری سیاست کے "دورِ جنوں" میں بھی لکھنؤ تہذیب اور انسانیت کا علمبردار رہا

ہے۔ رَواداری، بے تعصبی، امن واخوت کو لکھنؤ نے محض زبان سے نہیں سراہا، اُسے دل میں بھی جگہ دی، اُردو زبان یہاں محض بولی ہی نہیں گئی، دلوں کی آواز اور روحوں کی ترجمان بھی رہی۔ لکھنؤ میں اسے زبانِ شیخ ولب برہمن دونوں ملے اور دوسرے مقامات سے بہت زیادہ ملے۔ اس تہذیبی خصوصیت کو تنگ نظری اور رجعت پرستی کی ہوائیں جلد فنا نہیں کر سکتیں۔

آنند نرائن ملاؔ کشمیری ہیں، کشمیریوں کی ذہانت اور جمالیاتی احساس کو دنیا جانتی ہے۔ اُردو زبان وادب کی ترقی میں ان کا جتنا حصہ ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ آنند نرائن ملاؔ کے والد پنڈت جگت نرائن ملاؔ لکھنؤ کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ ملاؔ سال ۱۹۰۱ء میں یعنی بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوئے۔ جوبلی اسکول اور کیننگ کالج کی انگریزی تعلیم کے علاوہ اُردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کی وجہ سے انھیں عالمی ادب کے رجحانات ومیلانات سے بھی واقفیت کا موقع ملا۔ وکالت اس لئے اختیار کی کہ آبائی پیشہ تھا اور اس میں امتیاز بھی حاصل کیا۔ مگر ملاؔ کی سلامتِ طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ وکالت کے ہو کر نہ رہ سکے اور نہ کلب اور جدید سوسائٹی کی تفریحات اُن کے دل کی خلش اور دردمندی کو مٹا سکیں یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی ملاؔ لکھنو کے کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہیں لے دے کر چکبستؔ کا کچھ رنگ ہے۔ ورنہ وہ غالبؔ اور اقبالؔ سے زیادہ متاثر ہیں۔ انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح بھی نہیں لی اور صرف اپنی انفرادیت کو سہارا بنایا۔ ملاؔ کے یہاں اس طرح لکھنؤ کے عام ماحول سے بغاوت ملتی ہے، مگر لکھنؤ کی تہذیب کے اثرات اُن کی شخصیت اور مزاج میں ایک نکھرے اور ستھرے رنگ سے ملتے ہیں۔ دُنیا نے اُن سے اچھا سلوک کیا، اُنھیں خالی جیب اور ٹوٹے ہوئے دل ہی پر قناعت نہ کرنی پڑی، جو ایک نقاد کے الفاظ میں شاعروں کو خوب راس آتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں انیسؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے اشعار کے ترجمے کیے اور

انگریزی میں کچھ نظمیں کہیں بھی۔ مگر پنڈت منوہر لال زتشی کے اشارے سے اس ذہنی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا اور انھوں نے اردو میں شعر کہنے شروع کیے۔ ملاؔ کی شاعری میں وطن، حسن، انسان دوستی اور نئی دنیا کے محور ملتے ہیں، اُن کی شاعری ہمارے ادب کے تمام صالح میلانات کی آئینہ دار ہے اور اُن کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی ایک زندہ اور تابندہ تصویر۔

اُردو شاعری میں ایسے ناکام عاشقوں کی کمی نہیں ہے جو زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کو عشق کا المیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اردو کا عام شاعر دراصل حسن کا بھی پرستار نہیں۔ وہ اپنے حسنِ تخیل کا عاشق ہے۔ نظارے سے زیادہ وہ نظر کا قائل ہے۔ اُس کے مزاج کی یہ نرگسیت (NARCISSUSISM) غزل کی دُھندلی چاندنی میں بڑے لطیف سایے پیدا کرتی ہے۔ ان کی وجہ سے ہماری غزل کا بڑا حصہ ایک ایسی پرچھائیں بن گیا ہے جو تنقید کی روشنی کی تاب مشکل سے لا سکتا ہے۔ غزل کی تاریخ اور اُس کے ارتقا پر تبصرے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی یہاں گنجائش ہے مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اُردو کے اچھے اچھے شاعروں کا حسن کا تصوّر یا تو محدود ہے یا ناقص۔ زندگی اور اس کے نظارے کا حسن تو درکنار، یہ حسنِ نسوانی کا بھی بہت رومانی، بہت سطحی اور بہت مبالغہ آمیز تصوّر ہے۔ سماجی شعور کی کمی اس کی رندی اور رومانیت کو اور بھی عبرت انگیز بنا دیتی ہے۔ حالیؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ کی غزلوں کو چھوڑ کر پہلی جنگ عظیم تک اردو کا غزل گو شاعر مریض انفرادیت اور بیمار تخیل کا شکار رہا ہے یہ تینوں شاعر چونکہ صرف غزل گو نہ تھے اور شاعری کا زیادہ بلند اور وسیع تصوّر رکھتے تھے، اسلئے ان کے یہاں عشق میں سچائی اور سپردگی ہے، اگرچہ یہ عشق بڑے مقاصد اور قومی تقاضوں کا عشق ہے۔ لکھنؤ نے چونکہ اس نئے حسن و عشق کا راز ذرا دیر میں سمجھا اس لئے چکبستؔ سے پہلے یہ ہمیں غزل میں نہیں ملتا، ہاں نظموں میں صفیؔ نے اس کا اظہار کیا ہے چکبستؔ اور ملاؔ دونوں لکھنؤ کے ہیں مگر دونوں

کو ایک قومی تصور نے روایت کے اس سخت حصار سے باہر نکلنے کا بھی موقع دیا جو دوسرے شعرا کو گرفتار رکھنے میں کامیاب ہوا۔ ملاؔ نے جب ہوش سنبھالا اور ان کے خون نے جب شباب کی گرمی محسوس کی تو ہندوستان کافی بدل چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے ہندوستان کو اتنا بدل دیا جتنا کہ دو سو سال میں نہیں بدلا تھا اور دوسری جنگ عظیم نے تبدیلی اور تغیر کی اس رفتار کو اور بھی تیز کر دیا چنانچہ ۱۹۲۵ء میں ایک جوان اور حساس شاعر حسن کی رنگینی اور دنیا کے بدلتے ہوئے چہرے دونوں کا بیک وقت احساس کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ملاؔ کی نظموں اور غزلوں میں شروع سے ایک جدید ذہن ملتا ہے، اس جدید ذہن کی تربیت انگریزی ادب اور ملک کی سیاسی لہروں سے مل کر ہوئی ہے۔ یہ حسن کا فدائی ہے۔ وفا کے رسمی تصور سے بے نیاز ہے اور وطن کا عاشق بھی ہے یعنی شاعر یہاں ایک ایسا فرد ہے جو بعض اجتماعی ذمہ داریاں اور جذبات رکھتا ہے۔ ملاؔ کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت ہے اور نیازؔ نے موجودہ شعرا کا جو اپنا انتخاب شائع کیا تھا اس میں اس خصوصیت کا بجا اعتراف کیا تھا، مگر ۱۹۳۵ء تک ملاؔ کی غزلوں اور نظموں میں انفرادیت نہیں آئی ان میں تازگی، شگفتگی اور لطافت ہے مگر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہمیں چونکا دے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد ملاؔ کے فکر و فن میں انسان دوستی کا جذبہ ایسی گہرائی اور گیرائی اور ایک ایسی قوت شفا پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی طرف نگاہیں فوراً اُٹھ جاتی ہیں۔

نظموں میں "میری دُنیا"، "زمینِ وطن"، "ہم لوگ"، "نوروز"، "موتی لال نہرو"، اور "گاندھی" "حُبِّ وطن" سیاسی جدوجہد، قومیت کی تحریک اور آزادی کی خلش کو ظاہر کرتے ہیں۔ وطن پر اُردو میں اچھی اچھی نظمیں لکھی گئی ہیں خصوصاً چکبستؔ، ساغرؔ، افسرؔ، روشؔ، حفیظؔ، جوشؔ کی وطنی شاعری بڑی قابل قدر ہے مگر اس کے باوجود ملاؔ کی "زمینِ وطن"، اپنی غنائیت، شیرینی اور نکھری ہوئی کیفیت کی وجہ سے ممتاز ہے، چکبستؔ اور جوشؔ کی ایسی نظموں میں عظمت ہے مگر ملاؔ کے یہاں وارفتگی اور

سپردگی نغمگی اور دل نشینی زیادہ ہے۔ چکبست کا اثر موتی لال نہرو اور گاندھی میں بھی ظاہر ہوتا ہے مگر اس کے بعد ملاّ اس سے آگے نکل جاتے ہیں۔ چکبست کی سیرت نگاری کے بجائے ملاّ کی نظموں میں تفکر اور ایک بڑے نصب العین کی گرمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی شاعر کی حیثیت سے ملاّ کا درجہ چکبست سے بڑھ جاتا ہے۔

بیسوا، روحِ اضطراب، شاعرِ انقلاب زندہ باد، جامِ حیات، اقبال کے اثر کی یادگار ہیں ملاّ پر اقبال کے فکر و فن دونوں کا گہرا اثر ہے۔ لکھنؤ کے شعرا میں اقبال کے رنگ کو صرف ملاّ نے جذب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملاّ لکھنوی ہوتے ہوئے مقامی شاعر نہیں ہیں۔ اقبال کی شاعری فن کے بجائے زندگی کے حسن اور روحِ انسانی کے سربستہ رازوں کی پرستار ہے۔ اقبال کے یہاں شاعر قوم کی سیاسی، مضطرب، غیر مطمئن اور بیدار روح ہے جو انسانیت کے بلند مینار کی طرف نگراں ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو کرتی رہتی ہے اور اسی وجہ سے ہماری موت کی سی بے حسی، غلامی اور رسم و رواج کی اسیری سے بیزار ہے۔ ملاّ نے یہاں مذہب، وطن اور قومیت کے محدود اور جارحانہ تصور پر بے دھڑک وار کئے ہیں۔ اُن کی انسان پرستی، قوم و مذہب کے محدود تصور سے اتنی بیزار ہے کہ اقبال سے بھی مایوس ہو جاتی ہے اس اجمال کی کچھ تفصیل ضروری ہے

اقبال کے یہاں وطنیت سے مذہب کی طرف جو میلان ملتا ہے وہ قومی نقطۂ نظر سے بڑا مایوس کن ہے۔ اقبال کی وطنی شاعری میں بڑی دل کشی تھی۔ بڑا جوش اور جذبہ تھا، مگر یورپ کے قیام نے انھیں قومیت کے تصور سے نکلنا سکھایا۔ انھیں بین الاقوامیت اور انسانیت کا پرستار بنایا۔ اقبال کے نزدیک آفاقیت سب سے بڑا نصب العین بن گئی، مگر اس آفاقیت کے لئے اُنھوں نے جو خط و خال لیے وہ مذہب سے لئے۔ اقبال کے لئے مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ اس کی اخلاقی تعلیم اہم ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اقبال کی مذہبی اصطلاحوں، اُن کی

مذہبی زبان اور ایک مذہبی تہذیب و تمدن سے وابستگی اس آفاقیت کو مجروح بھی کرتی ہے۔ ہندوستان کی قومی تحریک کے دوش بدوش یہاں ایک تحریک مسلمانوں کے مذہبی احیار کی بھی چل رہی تھی، ملاؔ جیسے انسانیت پرست جو مندر و مسجد دونوں سے بیزار ہیں اور انسان کی خدائی پر ایمان رکھتے ہیں اقبالؔ کی اس آفاقیت کو جب مذہبیت اور مذہبی تحریکوں میں گھرا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ اقبالؔ سے ہی بیزار ہو جاتے ہیں، حالانکہ اقبالؔ اور ملاؔ دونوں میں انسان دوستی، جدید ذہن اور سماجی شعور ملتا ہے۔ ملاؔ جو شروع میں اقبالؔ کی طرح وطن کے پجاری تھے جب موجودہ دور میں وطنیت کے نام پر ہنگامے اور کشت و خون دیکھتے ہیں تو آزادی کی دیوی جس کے جلوؤں کے لئے اُنھوں نے کتنی ہی راتیں تارے گن گن کر گزاری تھیں، اپنی معصومیت کھو بیٹھتی ہے۔ وہ اس آزادی کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر خوش نہیں ہیں ؎

آہ! نادان پتنگوں کی تباہی کے لئے — کتنی ہنستی ہوئی شمعوں کے پیام آئے ہیں
کتنے ظلمات کے پالے ہوئے سایۂ شب رنگ — بن کے اک طورِ سرِ منظرِ عام آئے ہیں
ابنِ آدم کے لئے جبر کے کتنے نئے دور — لے کے انساں کی مساوات کا نام آئے ہیں

ہاں سمجھتا ہوں بلندی میں نہاں ہے جو نشیب
پھر بھی کھاتا ہوں میں آج اپنی تمنا کا فریب
ایک سجدے کو شناسائے جبیں اور کروں
دل کا اصرار ہے اک بار یقیں اور کروں

۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد ملک میں نفرت اور خون کی جو آندھی چل رہی تھی اور جس نے لاکھوں مردوں اور عورتوں کے جسم اور روح سے زندگی اور رعنائی چھین لی تھی۔ اُس نے ہندوستان کے ہر مہذب اور سچے انسان کی روح کو صدمہ پہنچایا، اُس نے تھوڑی دیر

کے لئے انسانیت پر ہمارے یقین کو متزلزل کر دیا۔ آدمی اس طرح جانوروں کو شرما سکتا ہے ؟ لوگ اس طرح عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سے بے رحمی اور بربریت برت سکتے ہیں؟ ملا کے درد مند دل نے بھی ہمارے اس داغ کو محسوس کیا اور وہ پکار اُٹھے ؎

غارت و قتل کی ہے گرمیِ بازار وہی ابھی انسان کی ہے فطرتِ خونخوار وہی

سب سے قانون بڑا آج بھی قانونِ قصاص سب میں مضبوط دلیل آج بھی تلوار وہی

ایک سے ایک سوا، کون کہے کس کو کہے اہلِ تسبیح وہی، صاحبِ زنار وہی

کس کو مظلوم کہیں، کس کو ستمگار کہیں آج مظلوم وہی، کل ہے ستمگار وہی

وطن اے میرے وطن! یوں مجھے مایوس نہ کر
شبھ گھڑی آئی ہے تیری اسے منحوس نہ کر

۱۹۴۷ء کے فسادات سے جب تعصب اور نفرت کا پیٹ نہ بھرا تو اس نے اس دور کے سب سے بڑے انسان اور آزادی کے رہنما کا خون بہانے میں بھی پس و پیش نہ کیا۔ مہاتما گاندھی کا قتل ایک شرمناک حادثہ ہے جس پر ہمارے وطن کی روح ہمیشہ ہمیشہ محجوب رہے گی۔ جو قوم و ملک کے لئے سب کچھ لٹا سکتا ہے اور جہاں اتنا کچھ دے سکتا ہے، اُس کے ساتھ یہ سلوک بھی روا ہو سکتا ہے؟ اُردو کے کئی شاعروں نے گاندھی جی کے قتل پر نظمیں لکھیں۔ ان میں روش، وامق، اقبال سہیل نشور واحدی اور مظہر جمیل کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں وامق اور ملا کی نظمیں صرف مہاتما گاندھی کی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ اُن کے پیام کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ وامق کی نظم کی عوامی اپیل زیادہ ہے مگر ملا کی نظم ایک ادب پارہ ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ گاندھی جی کے چیلے نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کی اخلاقی تعلیم اور انسان دوستی کے بہت بڑے فدائی ہیں۔

دو بند ملاحظہ ہوں ؎

سینے میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گُل کی لطافت کیا کہیے
جو زہر پیے امرت کر کے اُس لب کی حلاوت کیا کہیے
جس سانس سے دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہیے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اُس موت کی عظمت کیا کہیے

یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پر رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات

پستیِ سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ اُلفت دی
قاتل کو بھی گو لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی

"ہنسا" کو "اہنسا" کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک "پریم سندیسہ" لایا تھا

ملاؔ چونکہ ہماری تہذیب کی تمام اچھی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لئے اُن شخصیتوں کی اُنھوں نے خاص طور پر تصویر کشی کی ہے جو ہندوستان کی ساری تاریخ اور جدید رجحانات کا سارا رنگ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ مسز سروجنی نائڈو ہماری محفل کی ایک روشن شمع اور ہمارے گلستاں کا ایک سدا بہار پھول تھیں۔ ہماری سیاست اور ادب پر اُن کے گہرے نقوش ہیں مگر ہماری تہذیب پر اُن کی شخصیت کا لازوال اثر ہے۔ آنند نرائن ملاؔ نے سروجنی نائڈو پر اپنی نظم میں ان کی ساری تہذیبی صفات کو بڑی خوبی سے اُجاگر کیا ہے ؎

خزاں کی فصل میں بھی نکہتِ بہار رہی
وطن کے دورِ جنوں میں بھی ہوشیار رہی
خروشِ بزم میں بھی تو ترانہ بار رہی
جہنموں میں نسیمِ عدن سلام تجھے

غرورِ قومیت و دیں کے کوہساروں میں
نفاقِ نسل و تمدن کے ریگزاروں میں
الگ الگ سے حیاتِ جہاں کے دھاروں میں
ترانۂ دلِ گنگ و جمن سلام تجھے

ملّا اگرچہ اپنے وطن اور قوم سے محبت کرتے ہیں مگر وہ وطن کو قدرِ اعلیٰ نہیں مانتے، نہ وہ قومیت کے بت کے اندھے پجاری ہیں، اُن کی نظموں اور غزلوں میں انسان کی پرستش کا ترانہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کا کلام صحیفۂ انسانیت کہا جا سکتا ہے۔ وہ اگرچہ خیر و شر، نور و ظلمت، تہذیب و جہالت کی کشمکش کو معمولی نہیں جانتے اور نہ انسان کے اندر خوابیدہ حیوانیت سے چشم پوشی کرتے ہیں، مگر ارتقا اور انسانیت پر ان کا ایمان مستحکم ہے۔ ارتقا میں فرماتے ہیں۔

دیر تک رہتی نہیں اک جام میں صہبائے زیست   اس میں وہ تندی ہے پیمانے پگھلتے ہی رہے
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے   تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
ارتقا کی راہ میں رُکنا ہی ہے انساں کی موت   ہیں وہی زندہ جو اس رستے پہ چلتے ہی رہے

یعنی ملّا کا دل اپنی جگہ پر ہے اور اُن کے ذہن نے انہیں دھوکا نہیں دیا۔ بیسویں صدی کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ حیات کی پیچیدگی کا دور ہے۔ یہ آزادی کی جد و جہد اور اُس کے حقیقی مفہوم کی تلاش کا نام ہے۔ یہ شک اور یقین کی دھوپ چھاؤں ہے۔ یہ مشین کی حکومت اور انسان

کے بدلتے ہوئے ذہن کی داستان ہے۔ یہ امن کے خوابوں اور جنگ کے بادلوں کی کہانی ہے، یہ اژدہے کے دانت بونے اور خونریزی کی فصل کاٹنے کی بھول بھلیاں ہے۔ ان سب باتوں میں حقیقت کی جھلک ہے مگر یہ ساری حقیقت نہیں ہے۔ سائنس دانوں نے حقیقت کے راز تک پہنچنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ وہ عالمِ فطرت، حیات اور انسانی شخصیت کے متعلق بہت کچھ علم حاصل کر چکے ہیں مگر یہ علم ابھی مکمل نہیں ہے، ابھی انسان نیم حکیم ہے اور نیم حکیم خطرہ بھی ہوتا ہے۔ موجودہ پیچیدگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان نے طبیعاتی علوم میں بڑی ترقی کی ہے مگر اجتماعی علوم میں ترقی نہیں کی۔ اجتماعی علوم کی ترقی کے بغیر انسان جوہری بم تو گرا سکتا ہے، مگر اسے امنِ انسانی کیلئے استعمال نہیں کرتا۔ وہ بجلی کی اتھاہ طاقت پیدا کر سکتا ہے، اُسے انسانیت کے چراغاں کے لئے کام میں نہیں لا سکتا۔ سائنس ترقی کی طرف مائل کرتی ہے، مگر ادب ترقی کے لئے جذبہ پیدا کرتا ہے اور ترقی کے نصب العین کو "نوائے سینہ تاب" بناتا ہے اس لئے جدید شاعر کا فرض اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اُس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ نور و نغمہ کی دنیا کو چھوڑ کر اس سرزمین اور اس کے مسائل سے اپنا رشتہ مضبوط کرے اور یہاں نور و نغمہ کی جنت بناسکے۔ ترقی پسند شاعری کا یہی نصب العین ہے اور اس نے پچھلے پندرہ سال میں اس کی طرف اردو ادب کی رہنمائی بھی کی ہے۔

کیا ملاؔ کو ترقی پسند کہا جا سکتا ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ ترقی پسندی، سماجی شعور زندگی کی اہم اور زندہ قدروں کے احساس، انسانیت کے پرچار، تہذیب اور علم کی دولت کو عام کرنے، ہر فرد کو آزاد کرنے اور آزاد افراد کا ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کا نام ہے جو طبقات کی تفریق کو مٹا دے اور ذہنی اور مادی وسائل سے سب کو فائدہ اُٹھانے کا موقع دے۔ ملاؔ نے میری شاعری، جادۂ امن اور دوسری نظموں میں ترقی، آزادی، انسانیت کی جنت کے گیت گائے ہیں۔ اُن کی آخری نظم جادۂ امن میں، ہندوستان کو امن کی دعوت دی گئی ہے۔ امن

کی پکار انسانیت کی روح کی پکار ہے، اس میں ملاؔ چند خطرات کا ذکر کرتے ہیں ؎

بدل بدل کے رنگ ابھر رہا ہے فتنۂ جہاں
فن و ادب کو بھی پنہائی جا رہی ہیں وردیاں
گرج رہی ہیں بدلیاں، کڑک رہی ہیں بجلیاں
ادھر سیاہ آندھیاں، اُدھر ہیں سرخ آندھیاں
ان آندھیوں کے درمیاں ہی درمیاں بڑھے چلو
عَلَم کیے شہیدِ قوم کا نشاں بڑھے چلو

ملاؔ یہاں ایک بین بین راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں، اُن کی امن پسندی تو مسلّم ہے مگر انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جن سرخ آندھیوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ دراصل امریکہ کے اعصاب زدہ سرمایہ داروں کے ذہن کی پیداوار ہیں جس ملک نے ابھی پچھلی جنگ عظیم میں اتنے گہرے زخم کھائے ہوں کہ اس کا بچ نکلنا تاریخ عالم کے ایک معجزے سے کم نہ ہو، وہاں کے عوام کسی طرح بھی ایک اور مہلک اور انسانیت سوز جنگ کے لئے تیار نہیں ہوسکتے پچھلی لڑائی میں سب سے زیادہ محفوظ امریکہ رہا اور آج وہیں سے سرخ آندھیوں کا یہ غبار اڑایا جا رہا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ رہنا تو بہت اچھا ہے مگر موجودہ زمانے میں جب ساری دنیا ایک ہوگئی ہے یہ ممکن بھی ہے؟ اس لئے میرے نزدیک تمام مخلص اور دردمند انسانوں کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ جنگ کو ہر حال میں روکنے کی کوشش کریں اور امن پسند قوتوں کو وہ جہاں بھی ہوں مدد پہنچائیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ روس ایک امن پسند طاقت ہے وہ جنگ نہیں چاہتا، یہ دوسری بات ہے کہ مصیبت کے وقت حفاظت کے لئے ہر کوئی تیار ہوجاتا ہے۔

ملاؔ کی شاعری کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک ان کی طویل نظم "ٹھنڈی کافی" کا

نام نہ لیا جائے۔ اس نظم میں ہمیں محبت کی وہ فضا ملتی ہے جو اس دنیا کی ہوتے ہوئے بھی آسمانوں کی ہمراز ہے۔ اس کا فطری بہاؤ اور رار تقار، اس کی موزوں و تناسب تصویریں، اس کے نفسیاتی لمحے اور شوخ اشارے، اسے کامیاب محبت کا ایک دلکش ڈراما بنا دیتے ہیں۔ اس نظم کی فضا میں دو کردار اُبھرتے ہیں اور دونوں جادو کے کرشمے نہیں اسی دنیا کے انسان ہیں جو مل بیٹھتے ہیں تو دنیا کچھ اور حسین اور گوارا ہو جاتی ہے جو ذہنی پرچھائیاں نہیں گوشت پوست کے انسان ہیں یہ نظم جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔

ملّا اُن شاعروں میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اُن کے دل کی دولت نذرِ خوباں بھی ہے اور نذرِ دوراں بھی۔ اُن کی غزلوں میں ایک تازگیٔ تفکر اور مہذب لطافت ملتی ہے۔ اس کا نشہ بعض شعرا کی رندی، زندہ دلی اور رومانیت کے مقابلے میں کچھ مدھم معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کی نرمی، دل آسائی، قوتِ شفا، بڑی خاصے کی چیز ہے۔ لکھنؤ کے اکثر شعرا کی غزلیں اپنے رچے ہوئے اندازِ بیان اور چست و دُرست زبان کے باوجود پرانی معلوم ہوتی ہیں، ان کی فضا پرانی ہے، ان کی دنیا ہماری آج کل کی دنیا سے خاصی مختلف ہے، ان کی زبان میں انوکھا پن نہیں ہے جو ارسطو کے نزدیک اعلیٰ شاعری میں ضروری ہے جو انوکھے منفرد یا تازہ احساس سے آتا ہے، پھر یہ غزلیں ایک ایسا کیف و اثر پیدا کرتی ہیں جو الفاظ کا عشق سکھاتا ہے انسانوں کا عشق نہیں۔ فن کو سیکھنے کے لئے لکھنؤ اسکول کی غزلیں سب سے زیادہ مفید ہیں مگر زندگی کو سمجھنے کیلئے نہیں۔ حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق کی غزلوں میں تازگی ملتی ہے۔ حسرت کی دُنیا ہماری مانوس دنیا کے ایسے حسن کو پیش کرتی ہے جس سے ہم اب تک بے خبر تھے۔ فانی قدیم غزل سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی، اپنی یاسیت کے اعتبار سے بالکل مختلف اور منفرد ہیں۔ ایسی بھرپور اور گہری یاسیت بیسویں صدی

کے احساسِ شکست سے ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ اصغر کا تصوف اگر غالب اور مومن کے تغزل سے رموز نہ لیتا تو اس میں یہ لطافت اور تاثیر نہ آتی، جگر کی سرمستی اور رندی، عشق کو عبادت بناتی ہے اور عشق کی عظمت کی یادگار ہے۔ فراق کی دنیا میں نفسیات کی گہرائیاں ہماری غزل کے لئے نئی ہیں۔ ملاّ اس برادری میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ غزل کو بہت سے عاشق ملے مگر ملاّ انسانیت کے عاشق ہیں۔ انھیں بشر اپنی ساری پستیوں اور عظمتوں کے ساتھ عزیز ہے۔ ایک معنی میں ملاّ بھی رومانی ہیں۔ وہ ایک خواب سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر غزل خوابوں کی داستان نہیں تو کیا ہے۔ ملاّ کا کمال یہ ہے کہ خوابوں سے اس قدر عشق کے باوجود وہ حقایق کا احساس رکھتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کی فضا کو نظر انداز نہیں کر سکتے ؎

ملاّ یہ اپنا مسلکِ فن ہے کہ رنگِ فکر

کچھ دیں فضائے دہر کو کچھ لیں فضا سے ہم

غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے۔ یہ پیمبروں اور مصلحوں کے لئے نہیں، عاشقوں کے لئے ہے اور اس میں اگر آدمی زخم خوردہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ غزل پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ سب بجا اور درست مگر کتابِ دل کی تفسیر اور خواب جوانی کی تعبیر کی حیثیت سے اس کا جواز ہمیشہ رہے گا۔ ملاّ کی جوانی دیوانی تو نہیں، مگر رنگین ضرور ہے، اُن کے عشق میں وہ چمک دمک اور سپردگی تو نہیں جو جوش اور جگر کی یاد دلاتی ہے مگر گداز اور تاثیر قدم قدم پر ہے۔ ملاّ کا عشق ذرا سنبھلا ہوا اور مہذب عشق ہے مگر اس کی صداقت اور دل گدازی میں کلام نہیں۔ ملاّ کو جدید عاشق کی بے باکی نہیں آتی، وہ نگاہوں کی زبان کو سمجھتے ہیں اور اس کے ترجمان بھی ہیں۔ ملاّ کے یہاں نفسیاتِ انسانی کا علم بھی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کا اثر دیر میں ہوتا ہے مگر دیر پا رہتا ہے۔ ملاّ کی شخصیت کے گرد چونکہ اس قسم کا کوئی ہالہ نہیں ہے جو آج کل بہت سے

شاعروں نے رندی یا نعروں سے پیدا کرلیا ہے۔ اور نہ انھوں نے کسی سستے نشے کی دوکان لگائی ہے، وہ چونکہ کسی حلقہ یا برادری سے بھی وابستہ نہیں ہیں، اس لئے عام طور پر لوگوں نے اُن سے بے اعتنائی کی ہے۔ حالی کی طرح اگرچہ اُن کا مال نایاب ہے مگر گاہک اکثر بے خبر ہیں۔ انھوں نے کسی مشہور لیبل کی آڑ نہیں لی۔ وہ شاعری کی محفل میں کوئی ہیترا یا ڈھول لے کر نہیں آئے۔ میں اس بات کو اُن کی سلامتی طبع کی بہت بڑی دلیل سمجھتا ہوں۔ اُن کی ایک نمائندہ غزل اور چند منتخب اشعار سے میرے اس دعوی کی تصدیق ہوجائے گی ۔

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

خوشی کی معرفت اور غم کی آگہی نہ ملی
جسے جہاں میں محبت کی زندگی نہ ملی

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہوگئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

لبوں پہ پھیل گئی آکے موجِ غم اکثر
بچھڑ کے تجھ سے کلی کی طرح ہنسی نہ ملی

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

فلک کے تاروں سے کیا دور ہوگی ظلمتِ شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی

ابھی شباب ہے کرلوں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پہ عمرِ رواں ملی نہ ملی

وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار
رہِ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی

وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے ملاّ
کسی نگاہ کے سایے کی چاندنی نہ ملی

ہنر وہ ہے خاک کے ذرّے جو کر دے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

سختیِ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر   پھول تو کچھ کھلا دئے دامنِ کوہسار میں

ساقیا جب مے ہر اک میکش کی قسمت میں نہیں   سب کو اس محفل میں پیمانے عطا کیوں ہو گئے

شبِ غم میں بھی اے تصورِ دوست   زندگی کا مزا دیا تو نے

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اُس دل کی پریشانی نہیں جاتی

بس تو یہ بھی نہیں اک پھول قفس میں رکھ لیں
اور نگاہوں میں گلستاں کا گلستاں ہونا

مے کشوں نے پی کے توڑے جام مے   ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جب تک مزاجِ دل نہ بن جائے

ترے دل پہ حق ہے جہاں کا بھی یہ فرارِ عشق روا نہیں
غمِ دوست خوب ہے جب تلک غمِ زندگی کو بھلا نہ دے

یہ خزاں بدوش سموم تو ہے گلوں کے ظرف کا امتحاں
وہی گل ہے گل جو فسردہ ہو تو فسردگی بھی بہار دے

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

خروشِ بزم میں بھی سازِ دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو
کبھی تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹانا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری یارانِ بے خبر نے اسے فن بنا دیا

خونِ دل ضائع نہ ہو مجھ کو بس اتنی فکر ہے اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں یہاں رکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت　　　ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

جمالِ حسن میں تھا اک جلالِ عفت بھی　　　گناہ گار خیالِ گناہ کر نہ سکے

ہاں تم نے اعترافِ محبت نہیں کیا　　　نیچی کیے ہوئے ہیں نظر کیا حیا سے ہم

اردو شاعری نے ہمارے تہذیب و تمدن کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے اور اس میں جو انسانی اور عالمی قدریں پیدا کی ہیں اس کا اعتراف آج کل کی ہیجانی فضا میں مشکل ہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد ملک میں تنگ نظری اور ماضی پرستی کی اتنی گرم بازاری ہے کہ ہندوستان کو امن و اخوت کی ایک جنت بنانے میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی کوششیں اتنی مقبول نہیں ہیں جتنی ہونی چاہئیں لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان مساعی کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے۔ اردو کے افسانہ نگاروں، شاعروں اور نقادوں نے سخت آندھیوں میں تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے۔ اس اجالے میں ملا کی اپنی روشنی بھی کم نہیں اور اس لئے ان کا یہ فخر بالکل بجا ہے ؎

خزاں کے تند جھونکوں میں بھی خوابِ رنگ و بو دیکھا　　　جہنم میں بھی جس نے گل کھلائے ہیں وہ جنت ہوں

ملا کی پاکیزہ اور مہذب شخصیت، ان کی وضعداری اور ہماری تہذیبی روایات کی صحیح آئینہ داری ان کا وطنیت کا وہ تصور جو بین الاقوامیت کے لئے پہلی اینٹ کا کام دیتا ہے اور آزادی کے نزدیک صحیح بین الاقوامیت ہے، ان کا عوام کے دکھ درد کو اپنانا اور تسبیح و زنار سے بلند ہو کر دیکھنا، ان کا تازہ ہواؤں اور نئی فضاؤں کے لئے دل و دماغ کے دریچوں کو کھلا رکھنا، انسانیت سے یہ شدید، گہرا اور پُرجوش عشق، موجودہ دور میں جبکہ زندگی کی سختیوں اور تلخیوں نے اچھے اچھوں

کے حواس باختہ کردیئے ہیں ہمارے لئے ایک روشنی کا مینار رہے، اُن کے مزاج کی نرمی، اُن کے واضح نصب العین اور پختہ شعور کے ساتھ مل کر ہمارے ادب کا ایک نشان راہ بن جاتی ہے اُن کے کلام میں ہمیں بیسویں صدی کی زندگی کے سارے موڑ نظر آتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کے تمام صالح عناصر بھی۔ نیازؔ نے اُن کی نظموں میں تغزل کی تعریف کی ہے۔ ان کی نظر انکی نظموں کے تعمیری حسن تناسب اور گہرے سماجی شعور پر نہیں گئی۔ غزل کی صف میں جب عشاق کا ذکر آئے گا تو انسانیت کے اس عاشق کو کوئی فراموش نہ کرسکے گا، اور آج جب بعض حلقوں میں اُردو کو اُس کے دیس میں بدیسی کہا جارہا ہے ملاؔ کا یہ شعر ایک خاموش تازیانہ بن کر زندہ رہے گا ؎

لب مادر نے ملاؔ لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

۳ نومبر ۱۹۴۹ء
۷۔ بیرورروڈ لکھنؤ

آل احمد سرور

بہ قلمِ خود

میری کوئی نیت نہ تھی کہ میں بہ طور تمہید کے کچھ لکھوں لیکن جب اس مجموعہ کی ترتیب کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ چار صفحے خالی رہے جاتے ہیں اور انھیں کسی طرح بھرنا ہے تو میں نے یہ موقع اپنی انشا پردازی دکھانے کے لئے ڈھونڈ لیا اور چند صفحات کو اپنے خیال میں رنگین (اور دوسروں کی رائے میں غالباً سیاہ) کرنے کی صورت نکال لی۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ مجموعہ شائع کر کے میں اُردو ادب کے دامن کو کچھ نئے پھول دے رہا ہوں یا کانٹے۔ اگر یہ پھول ہیں تو کسی معذرت کی ضرورت نہیں لیکن اگر یہ کانٹے ہیں تو اس جرم کی ذمہ داری تنہا میری ہے۔ ”احباب کے اصرار“ کا رسمی بہانہ پیش کر کے عذرِ تقصیر کرنا میرے نزدیک نہ تو صحیح ہے اور نہ مناسب۔

اس کا تو میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں نقش کس صورت سے اُبھرے گا لیکن اس مجموعہ کو دیکھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بونے کو تین پہلوان اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوں۔ مجھے اپنی ادبی کم قامتی کا احساس ہے اور جو ادبی تنقیدیں بالغ اور نابالغ دونوں قسم کے نقادوں کی اکثر رسالوں میں برابر نکلتی رہتی ہیں اُنھیں پڑھ کر یہ احساس اور زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

مجھے اس اخلاقی کمزوری کا اعتراف ہے کہ اپنے بارے میں کسی کی اچھی رائے سُن کر دل کو خوشی ہوتی ہے، شاید اس سے میرے پندار کو تسکین ملتی ہے۔ میں محترمی نیاز فتحپوری کا خاص طور پر ممنون

ہوں کہ انھوں نے میرے کلام کو قابلِ توجہ سمجھا اور میری حیثیت سے زیادہ مجھے مرتبہ دیا، یہ اُن کا حُسنِ نظر ہے کہ "بازوئے کبوتر" میں بھی انھوں نے "پر و بالِ شاہیں" دیکھ لیئے۔ سرور اور احتشام میرے دوست ہیں، میں نے انھیں دوست کہہ کر سب کچھ کہہ دیا اور دوست بھی کیسے شاید انھیں کے لئے میں نے یہ شعر کہا تھا ؎

وہ راز جس کا ابھی دل بھی راز دار نہیں
نگاہِ دوست کو اُس کی بھی ہے خبر مُلّاؔ

ایسے دوستوں کا زبان سے شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔

مجھے یہ پڑھ کر یقیناً بڑی حیرت ہوئی کہ احتشام نے اشارۃً اور سرور نے صریحاً میرا شمار ترقی پسند شعراء میں کیا ہے۔ آخر میں ترقی پسند کس طرف سے ہو گیا؟ نہ تو میں مزدور کو فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں اور نہ مزدور راج قائم کرنے کے لئے کُشت و خون کی ترغیب دینے ہی کو شاعری کا اصل مقصد قرار دیتا ہوں۔ رہ گئی انسان دوستی تو اب یہ بھی اُس مخصوص حلقۂ ادب میں جس پر بہنی کی مہر لگی ہے مشکوک نگاہوں سے دیکھی جانے لگی ہے۔ مستند ترقی پسند نظریہ اب اسے بھی ایک فریب سمجھتا ہے جیسے کسی بچے کو چاند دکھا کر اُس کے سامنے سے مٹھائی کی طشتری غائب کر دینا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری وجہ سے ان دونوں کے ادبی وقار پر حرف نہ آئے اور یہ ندامت مجھے اُٹھانی پڑے۔

اس مجموعہ کا نام "جوئے شیر" رکھنے میں یقیناً شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ اس میں دوکانداروں کا وہ اصول بھی شامل ہے جو اپنے مال کو دس گُنے دام لگا کر گاہک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ گاہک اور دوکاندار کے درمیان قیمت کے بارے میں ایک طویل تبادلۂ خیالات ہونے کے بعد سودا طے ہو جاتا ہے۔ گاہک اپنے دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں دوکاندار کے بھرے میں نہیں آیا اور میں نے

مناسب دام پر ال پایا۔ دوکاندار اِدھر مطمئن ہوتا ہے کہ اُس نے پھر بھی اچھا خاصا نفع حاصل کیا ہیں نے بھی اپنے کھاری پانی کو "جوئے شیر" کہہ کر پیش کیا ہے کہ شاید اسی طرح پڑھنے والوں کا اور میرا "جوئے آب" پر توڑ ہو جائے۔ وہ اسے کھاری نہ کہیں اور میں تسلیم کر لوں کہ یہ غذا نہیں ہو بلکہ میٹھا پانی ہے۔

اس مجموعہ میں عروض و زبان کے اعتبار سے غالباً متعدد غلطیاں ملیں گی۔ ان میں سے کچھ تو ایسی ہوں گی جو میرے علم میں بھی نہ ہوں گی لیکن بہت سی ایسی ہیں جن سے میں واقف ہوں۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی انھیں دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ میں نے اپنے ذوق کو مروّجہ اصولِ شاعری پر ہمیشہ ترجیح دی۔ میں اس سے زیادہ اس وقت کچھ اور کہنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ بحث تفصیل طلب ہے اور یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

"جوئے شیر" کی ترتیب اور کتابت کے بعد میں نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں ایک غزل کہی ہے نامناسب نہ ہوگا اگر میں اُسے یہاں شامل کر دوں۔

غزل

سینہ کی حرارت سے خالی گرمیِ چراغِ شام نہ لے
یہ دل ہے امانت دنیا کی اپنا ہی بس اس ہے کام نہ لے

ہستی ہے نام تسلسل کا ماضی سے مفر ممکن ہی نہیں
وہ صبح نہ ہوگی صبح کبھی جو جائزۂ ہر شام نہ لے

مے سب کو نہ ہو تقسیم اگر اپنا بھی اُلٹ دے پیمانہ
یہ کفر ہے کیشِ رندی میں ساقی سے اکیلے جام نہ لے

قدرت نے کیا انساں کو عطا امید بھرا دل یہ کہکر
رنگ اس سے تیرے ہر قصہ کا آغاز تو لے انجام نہ لے

پینے والے انداز سے پی یہ زہر بھی ہے اور امرت بھی
کیفیتِ ایام کے دھوکے میں دیوانگیِ ایام نہ لے

یا دل میں نہ دے نفرت کو جگہ یا حرفِ محبت لب پہ نہ لا
یہ نام نہ لے لیتا ہے تو پھر یہ نام برائے نام نہ لے

اس جہدِ خرد کے میداں میں کچھ بھی نہ ملے لاشوں کے سوا
گرتے ہوئے مضروبوں کو اگر آغوشِ محبت تھام نہ لے

یہ بخیہ گری ہے نیش زنی یوں غم کا مداوا کیا ہوگا
پھولوں کے کلیجے چاک ہوں جب کانٹوں سے رفو کا کام نہ لے

خاموشی بھی ہے ضبط کوئی، ہے کیشِ وفائے عشق تو یہ
نظروں کو بھی پی جا آنکھوں میں اشکوں سے بھی اس کا نام نہ لے

کب تک ترتیب یونہیں ہوگا ہر ایک فسانہ ہستی کا
اللہ کو نیند آتی ہی رہے شیطان کبھی آرام نہ لے

اس مے کو نہ پی قطرہ قطرہ گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح جینے کا فقط الزام نہ لے

محفل کے سبو و جام سے لے ملّاؔ نہ کبھی اپنی صہبا
لے کیفِ مذاقِ عام مگر بر سطحِ مذاقِ عام نہ لے

"جوئے شیر" شائع کرتے ہوئے میرے دل کا وہی عالم ہے جو والدین کا لڑکی کو سسرال رخصت کرتے وقت ہوتا ہے۔ یا کسی مسافر کا اُجلے کپڑے پہنے ہوئے ہولی کی صبح کسی اجنبی شہر کے بازار میں پہونچ کر ہوتا ہے جہاں رنگ کھیلنے والوں کے غول پچکاریوں سے مسلح موجود ہوں اور نئے شکار کے منتظر ہوں۔ خیر کیا مضائقہ ہے دیکھا جائے گا۔

اب میں اس بکری کو دعائے زندگی دے کر قصائی باڑے کی طرف ہانکے دیتا ہوں۔ خدا حافظ!

آنند نرائن ملّا

۱۵ ر دسمبر ۱۹۴۹ء

سنہ ۱۹۲۶ء

پرستارِ حُسن

اپنے سوزِ غم کی شرحِ داستاں کیونکر کروں
دل کی جو باتیں ہیں وہ نذرِ زباں کیونکر کروں
بات جو مجھ سے بھی پنہاں ہو بیاں کیونکر کروں
اپنی ہستی کو زمانہ پر عیاں کیونکر کروں

دردِ دل کو غم کہوں، اُلفت کہوں، سودا کہوں
میں یہی حیران ہوں کس سے کہوں اور کیا کہوں

اے شعاعِ برق زائے خاورِ پہنائے حسن
اے شرابِ دلگدازِ ساغرِ مینائے حسن
اے شرارِ عقل سوزِ شعلہ سینائے حسن
اے نگاہِ فتنہ خیزِ دیدہ بینائے حسن

تو نے سینہ میں یہ کیسا درد پیدا کر دیا
میری ہستی کو مرے دل سے ثنا سا کر دیا

آرزوئیں دل کی ساری بیخبر تھیں مست خواب
جانتا تھا کون کہتے ہیں کسے جوشِ شباب
یک بیک تو نے رُخِ پُرنور سے اُلٹی نقاب
اک نظر میں ہاتھ سے جاتی رہی تسکین و تاب

غنچۂ دل اک اشارے سے ترے کھِلنے لگا
مجھ کو رازِ آفرینش کا پتہ ملنے لگا

سامنے تھا جلوہ گرحسن ازل مستانہ وار　　دل فریب و دل گداز و دل رُبا و دل شکار
فتِ صبر و تحمل، دشمنِ صبر و قرار　　اور کیا کرتا اگر کرتا نہ دل اپنا نثار

دل تھا یوسف اور اُدھر تھی دولتِ بیدارِ حُسن
کھینچ ہی لائی اُسے آخر سرِ بازارِ حُسن

وامنگوں میں مری مجھ کو نظر آنے لگا　　تو تصور میں مجھے رہ رہ کے تڑپانے لگا
یں نے جب دیکھا مرے قابو سے دل جانے لگا　　نقشۂ عبرت دکھا کر اس کو سمجھانے لگا

کچھ نہ کچھ میرے ارادوں میں مگر خامی رہی
لاکھ کوشش کی مگر افسوس ناکامی رہی

یں نے پہلے تجھ سے بچنے کی بہت تدبیر کی　　دل کے بہلانے کو دنیا اک نئی تعمیر کی
جب نہ یوں مانا تو پھر دھمکی بھی دی تعذیر کی　　بیڑیاں اس کو پنہائیں عقل کی زنجیر کی

تو مگر میرے خیالوں میں بھٹکتا ہی رہا
آرزو بن کر کلیجے میں کھٹکتا ہی رہا

ہو گیا مجبور ہو کر میں ترا آخر غلام　　جستجو ہی میں تری میں نے بسر کی صبح و شام
عقل و دانش کو کیا بس دور سے میں نے سلام　　آنکھ میں تھی شکل تیری اور لب پر تیرا نام
جب سے دل کے بتکدے میں تیری مورت دیکھ لی　　میں نے جس صورت میں چاہا تیری صورت دیکھ لی

تو ہر اک ذرّہ کے دل میں ضَو فگن مجھ کو ملا — رنگ بن کر صورت آرائے چمن مجھ کو ملا
تو ہر اک محفل میں شمعِ انجمن مجھ کو ملا — بزم دنیا میں تو ہی ہنگامہ زن مجھ کو ملا

جلوہ زن آنکھوں میں کچھ ایسی تری تنویر تھی
میرے ہر آنسو کے قطرے میں تری تصویر تھی

اس تلاشِ حسن میں یہ دل کچھ ایسا ہو گیا — اک نئی صورت کا یہ ہر روز جویا ہو گیا
آج شیریں پر تو کل لیلےٰ پہ شیدا ہو گیا — جس حسیں کو اس نے دیکھا بس اسی کا ہو گیا

میں نے اس نکتہ میں خامی آج تک پائی نہیں
حسن کا شیدا نہیں جو دل کہ ہرجائی نہیں

حُسن سے میری غرض جز خوبیٔ صورت نہیں — جز پرستش کے مرے دل کی کوئی حاجت نہیں
گرمیٔ شوق و تمنّا سے مجھے رغبت نہیں — حسن کے بندے جو ہیں وہ بندۂ الفت نہیں

پاک نیت ہو تو جھگڑے عشق میں پڑتے نہیں
شمع کی اُلفت میں پروانے کبھی لڑتے نہیں

حُسن جس پر ختم ہو ایسی تو صورت ہی نہیں — جو نہ ہو محوِ طلب انساں کی فطرت ہی نہیں
ہو نہ گلشن میں جو آوارہ وہ نکہت ہی نہیں — ایک کی ہو کر رہے جو وہ طبیعت ہی نہیں
دل ہو شیدائے چمن اس کی محبّت عام ہے — شہد کی مکھی ہے یہ ہر گُل سے اسکو کام ہے

گنگا کے چراغ

بِ گنگا کیا ہی مستانہ ترا انداز ہے — جھوم کر چلنے پہ تیرے مجھ کو کیا کیا ناز ہے

مرے جذبات کی دنیا کا تو ہمراز ہے — تیری لہروں میں مری تخئیل کی پرواز ہے

اپنی موجوں کا تلاطم آ مرے سینہ میں دیکھ
عکس اپنی بے کلی کا دل کے آئینہ میں دیکھ

ہ تک آنکھوں میں ہے تیرا سماں اے ہردوا — وہ ہجوم مہوشاں محو تماشا بر کنار

صفائے آب اخضر میں چراغوں کی بہار — دیکھ کر جن کو یہی کہتا تھا دل بے اختیار

تا بہ سطح آب ہر گوہر ابھر آیا ہے کیا؟
آسماں سے کر ستاروں کو اُتر آیا ہے کیا؟

شعاعِ مہر کے ذرّے پریشاں ہو گئے — فیض سے خورشید کے یہ خود درخشاں ہو گئے

ے آب پاک کے جوہر نمایاں ہو گئے — کیا کسی کے داغِ عصیاں نورِ ایماں ہو گئے

رقص کرنے کے لئے جگنو نکل آئے ہیں کیا
پھول جنت کے فلک والوں نے برسائے ہیں کیا

یہ مسافر کون ہیں کیسا ہے ان کا کارواں
کیا اسی کا عکس ہے کہتے ہیں جس کو کہکشاں

کس قدر پیاری ہیں انکی چھوٹی چھوٹی کشتیاں
یہ کہاں سے آئے ہیں بہرِ تماشائے جہاں

اہلِ دنیا کو تری عظمت دکھانے کے لئے
سورگ سے اُتری ہیں کیا پریاں نہانے کے لئے

گھورنے والوں کی نظروں سے یہ گھبراتی نہیں
پیکرِ نوری کی عریانی سے شرماتی نہیں

ہاں یقیں انساں کی باتوں کا یہ لاتی نہیں
موجِ دریا چھوڑ کر ساحل تلک آتی نہیں

حُسن دکھلاتی تو ہیں لیکن کچھ اس انداز سے
اپنا جلوہ خود چھپا لیتی ہیں اپنے ناز سے

اے چراغِ آبِ گنگا تجھ میں کیسا نور ہے؟
تو کسی عاشق کا دل ہے یا جبینِ حور ہے؟

اک جھلک دکھلا کے پھر موجوں میں تو مستور ہے
حُسن کا چشمِ تمنا سے یہی دستور ہے

تیرا جلوہ کیا کسی مظلوم کی تقدیر ہے
ایک ہستی کے امید و بیم کی تصویر ہے

کیا تری تقدیر میں انساں کی رنجوری بھی ہے؟
کیا ترے دل میں تمناؤں کی مجبوری بھی ہے؟

سینۂ نوری میں تیرے ذوقِ مہجوری بھی ہے؟
کیا ترے جامِ گلی میں آبِ انگوری بھی ہے؟

کس کی اُمیدوں کی گلکاری ترے دامن میں ہے؟
آرزو کس کی فروزاں تیرے پیراہن میں ہے؟

تو کسی کے سوز دل کا شعلۂ مستور ہے — تو کسی کی دیدۂ گریاں کا سارا نور ہے

تجھ میں ساری التجا سے خاطرِ مجبور ہے — تو کسی بیکس کی نظروں میں چراغِ طور ہے

اک خلوصِ دل کی تجھ میں انتہائی شان ہے

جلوۂ خورشید تیرے نور پر قربان ہے

۹

شمع

شب کو محفل میں عجب ہنگامۂ پُر شور تھا　　بادۂ شوق و تمنا سے ہر اک دل چور تھا
حسنِ یوسف، عشق مجنوں، نعرۂ منصور تھا　　ہر چراغِ انجمن رشکِ چراغِ طور تھا

چشمِ ساقی کا ہر اک میکش سے وہ اصرار تھا
ہوش کا دعویٰ ہی کرنا بزم میں بے کار تھا

مست سب تھے اور کسی کو فکرِ رسوائی نہ تھی　　بے حجابی تھی مگر چشمِ تماشائی نہ تھی
کون دل تھا آرزو لے کر جسے آئی نہ تھی　　کون صورت تھی کہ جو محوِ خود آرائی نہ تھی

بے خودیِ شوق سے کل انجمن سرشار تھی
ہاں فقط اک شمعِ محفل تھی کہ جو ہشیار تھی

شمع سے میں نے کہا تو کس لئے خاموش ہو　　ہر طرف جوشِ طرب ہے شور نالے و نوش ہے
آرزو امید سے محفل میں ہم آغوش ہے　　تجھ کو لیکن فکرِ فردا ہے کہ رنج دوش ہے

تجھ پہ عریاں کون سا رازِ نہانی ہوگیا
تلخ کیوں جامِ شرابِ زندگانی ہوگیا

کیا تجھے معلوم ہے اصل و مجاز زندگی　　ایک مدت سے ہوں میں جویائے رازِ زندگی
کچھ سنا مجھ کو حدیثِ دل گداز زندگی　　میں بھی کچھ سمجھوں کہ کیا ہے سوز و ساز زندگی

نور جو تجھ میں نہاں ہے کچھ تو بتلا کیا ہے یہ
حسن کی تنویر ہے یا عشق کا جلوا ہے یہ

کچھ بتا کیا لذتِ سوزِ نہانی دیکھ لی　　اک ذرا لب کھول تیری بے زبانی دیکھ لی
حالِ دل کہہ تیرے اشکوں کی رُوانی دیکھ لی　　گل فشانی کر تری گوہر فشانی دیکھ لی

کام کا کس کے یہ تیرا نورِ بزم افروز ہے
آگ محفل میں لگا دل میں اگر کچھ سوز ہے

شمع نے سن کر کہا دل سوز ہے تیرا خطاب　　بڑھ گیا باتوں سے تیری اور میرا اضطراب
آج تک چھوٹا نہ تھا مجھ سے کبھی یارائے تاب　　لیکن اب دینا ہی پڑتا ہے مجھے تیرا جواب

تا بہ لب افسانۂ دل میں کبھی لائی نہ تھی
مے جو شیشہ میں تھی پیمانے تلک آئی نہ تھی

میں نے اس دنیا کی تصویرِ نہانی دیکھ لی　　ایک شب میں سب بہارِ زندگانی دیکھ لی
راحتِ موہوم کی دنیائے فانی دیکھ لی　　درد ہی میں بس حیاتِ جاودانی دیکھ لی
تو مگر اب تک اسیرِ دامِ ہست و نیست ہے　　تو فنا ہونا جسے کہتا ہے میری زیست ہے

داغِ دل ہی سے فروغِ لالہ زارِ عشق ہے
اشکِ رنگیں ہی سے یہ نقش و نگارِ عشق ہے

نورِ ہستی جلوۂ سوزِ شرارِ عشق ہے
خون میں ڈوبی ہوئی ساری بہارِ عشق ہے

عشق میں یہ حالِ دل ہے کون سمجھائے اسے
یہ اسی پر جان دیتا ہے جو تڑپائے اسے

جان دے اور پھر بہارِ باغِ دنیا دیکھ لے
اشک خوں میں اضطرابِ موجِ دریا دیکھ لے

دل جلا کر حسنِ فطرت کا نظارا دیکھ لے
خود تڑپ پھر سوزِ ہستی کا تماشا دیکھ لے

دردِ الفت گر نہیں ہے حسن پیدا ہی نہیں
چشمِ موسیٰ ہو نہ جب تک نورِ سینا ہی نہیں

سنہ ۱۹۲۷ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

غزلیات

صیاد کے ستم سے آنا تو فرق ہاں ہے　　پہلے اک آشیاں تھا اب یادِ آشیاں ہے

کہنے کو لفظ دو ہیں امید اور حسرت　　ان میں نہاں مگر اک دنیا کی داستاں ہے

اے مشتِ خاک شمع دل کو بجھا نہ ہرگز　　یہ ہی تو اک شرارِ ہستیِ جاوداں ہے

ہے حسن بھی اک آفت باغِ جہاں میں اے گل　　کس کس سے تو بچے گا گلچیں ہے باغباں ہے

جینے کا لطف سارا اُلفت کی یاد سے ہے

پہلے جو دردِ دل تھا اب وہ سکونِ جاں ہے

بچ کے جائے گا کہاں تو دیدۂ بیباک سے　　منھ چھپا لے لاکھ اپنا برقِ افلاک سے

خوب دیکھا تو نے اسے مے دہر کا پست و بلند　　چڑھ گئی رندوں کے سر اتری جو شاخِ تاک سے

کھو دیا سارا فریبِ رنگ و بوئے باغِ حسن　　ہم تو عاجز آ گئے ہیں دیدۂ ادراک سے

تنکے تنکے آشیاں میرا کیا تو نے تو کیا　　میں نشیمن پھر بنا لوں گا اسی خاشاک سے

سینکڑوں میں میں تجھے پہچان لوں گا پردہ پوش　　چال سے انداز سے گفتار سے پوشاک سے

پینے سے توبہ کی خاطر میکدے جاتے ہیں شیخ　　آدمی معلوم ہوتے ہیں مجھے چالاک سے

نالہ گر رُکتا نہیں پیدا نہیں ہوتا سُرود　　نغمۂ غم کیا سناؤں سینۂ صد چاک سے

اک نظر پہلے اِدھر پھر زلف میں کرنا اسیر　　صید اگر زخمی نہیں چھٹ جائیگا فتراک سے

دخترِ رز کو لباسِ جام و مینا ہے عبث
اس کی عریانی نہیں چھپتی کسی پوشاک سے

خیالِ جام رہا عادتِ شراب کے ساتھ　　میں بادہ کش ہوں مگر حسنِ انتخاب کے ساتھ

زبانِ خلق سے مٹ جائے لذتِ عصیاں　　مزا ذرا سا ملا دے اگر ثواب کے ساتھ

وہ دیکھنے تو لگے ہیں مجھے چرا کے نظر　　حجاب ٹوٹ رہے ہیں مگر حجاب کے ساتھ

فقط فریب خد و خالِ حسن باقی ہے　　جو چیز صبر شکن تھی گئی شباب کے ساتھ

غریقِ یاس ہوا دل یہ آرزو تو نہیں　　اُبھر رہی ہے جو رہ رہ کے ہر حباب کے ساتھ

دل غریب سے ان آنسوؤں کی لذت پوچھ　　نکل رہے ہیں جو فریادِ مستجاب کے ساتھ

غمِ حیات شریکِ غمِ محبت ہے　　ملا دئے ہیں کچھ آنسو مری شراب کے ساتھ

بس اب تو حضرتِ دل کیجئے کرم مجھ پر
جہاں میں خوار ہوا ہوں بہت جناب کے ساتھ

ذوقِ ستم کشی سے وہ لاچار ہو گئے　　عاجز مری وفا سے ستم گار ہو گئے

پی ہے یہ کس کی چشم سے صہبائے آرزو　　کیوں آج ارغواں تمہارے رخسار ہو گئے

اِک بار کی تھی عرضِ تمنا میں کچھ کمی — اور حُسن کی نظر میں گنہگار ہو گئے

اک شمع دل کے بجھتے ہی زنداں ہوئی حیات — در جلنے سامنے تھے وہ دیوار ہو گئے

تنقید اب یہ ہے کہ مٹا کر کمالِ غیر
اپنے سخن کے آپ پرستار ہو گئے

دل میں ارماں کی وہی جلوہ گری باقی ہے — شام کے وقت بھی نورِ سحری باقی ہے

تو نہ چھوڑے گی اُسے بھی مگر اے دیدۂ تر — وہ جو اک قطرۂ خونِ جگری باقی ہے

دل ہے جب تک مرے پہلو میں غمِ دہر ہو کیوں — ایک مینا ابھی صہبا سے بھری باقی ہے

پھر بہار آئے گی لے کر گل و جام دمے دھر — چند دن اور یہ دورِ قمری باقی ہے

میری اُلفت نے انھیں کر تو لیا ہے اپنا
اب فقط شرم کی سینہ سپری باقی ہے

دُور ہی سے دل ہی دل میں ہم تمہیں چاہا کئے — بند کر لی آنکھ اور پہروں تمہیں دیکھا کئے

کب تلک امید پر کوئی جیے لے بے وفا — عمر گزری اعتبارِ وعدۂ فردا کئے

ظلمتِ دنیا میں جلوے تھے ترے مستور کچھ — ہم چراغ زندگی لیکر جنھیں ڈھونڈا کئے

مختصر اپنی حدیثِ زیست یہ ہے عشق میں — پہلے تھوڑا سا ہنسے پھر عمر بھر رویا کئے

اپنا دردِ دل سمجھنے کی یہاں فرصت کسے — ہم تو اوروں کا تڑپنا دیکھ کر تڑپا کئے

وہ ہمارے عشق کو سمجھے کرشمہ حسن کا
حسن کو ہم اک فریب آرزو سمجھا کئے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے — سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

اک احساسِ فضیلت، برتری کی دل میں اک خواہش — قفس کو تیلیاں دیتے ہیں شاخِ آشیاں والے

نہ ڈھونڈو اپنے شیداؤں میں تم فرہاد و مجنوں کو — زمانے میں نہیں ملتے یہ عاشق داستاں والے

رہِ ہستی یقینِ بے بصر کو اک مہم ہو گی — سفر کا لطف لوٹیں گے تو وہ وہم و گماں والے

ترے کوچہ میں مشتاق اک جلوے کے بیٹھے ہیں — نظر والے، جگر والے، قلم والے، زباں والے

وہی ذوقِ تجسس ہے، وہی جوشِ تقاضا ہے — ابھی آدم کے تیور ہیں وہی باغِ جناں والے

انھیں نادانیٔ رہبر سے میں نے کیوں کیا واقف
خفا اس بات پر مجھ سے ہیں میرے کارواں والے

میں فقط انساں ہوں ہندو مسلماں کچھ نہیں — میرے دل کے درد میں تفریقِ ایماں کچھ نہیں

دو دلوں کو اک نظر نے کر دیا تا زیست ایک — اور الفت کی زباں میں عہد و پیماں کچھ نہیں

چند موجیں بحرِ غم کی آ گئیں ساحل تلک — میری آنکھوں تک جو آیا ہے یہ طوفاں کچھ نہیں

کہہ گئی کیا آ کے اس کے کان میں بادِ بہار — گل کی یہ حالت ہے فکرِ جیب و داماں کچھ نہیں

خوں کا ہر قطرہ متاعِ آفرینش سے ہے پر — میرے دل میں قیمتِ لعلِ بدخشاں کچھ نہیں

دل وہ دیوانہ ہے جس کو خوفِ زنداں کچھ نہیں   وسعتِ صحرا لیے پھرتا ہے اپنے ساتھ ساتھ

چھیڑتے ہو کیوں مجھے کیوں پوچھتے ہو حالِ دل
کیا مرے رنگِ تبسم سے نمایاں کچھ نہیں

پیریِ انساں کا منظر سخت دردانگیز ہے   یہ کھنڈر سب سے سوا دنیا میں عبرت خیز ہے

تو فریبِ چشمِ ساقی میں دلِ ناداں نہ آ   ظاہرا یہ جسم ہے باطن میں مگر چنگیز ہے

کامرانی عشق میں فرہاد ہمت سے نہیں   خندہ زن تیشہ پہ تیرے حیلہ پرویز ہے

عرصۂ ہستی میں سارا دل پہ ہے دارومدار   ہے یہی راکب، یہی مرکب یہی مہمیز ہے

آہنِ قسمت نہیں کاٹے سے کٹتا عقل کے   یہ چھری بس خونِ دل کرنے میں بیشک تیز ہے

زندگی کا کون سا جلوہ نگاہِ گل میں ہے
دل تو ہے صد چاک لیکن لب تبسم ریز ہے

فرق جو کچھ ہے وہ مطرب میں ہے اور ساز میں ہے   ورنہ نغمہ وہی ہر پردۂ آواز میں ہے

ترجمانِ غمِ دل کون ہے اشکوں کے سوا   اک یہی تارِ شکستہ تو مرے ساز میں ہے

مرغِ آزاد اسیروں کو حقارت سے نہ دیکھ   ان کی طاقت بھی ترے بازوئے پرواز میں ہے

ایک لے دے کے تمنا ہے سو وہ بھی ناکام   دل میں کیا ہے جو تری جلوہ گہِ ناز میں ہے

دل کو دیوانہ سمجھ کر نہ بہت چھیڑو تم   کہیں کچھ کہہ نہ اُٹھے یہ حرمِ راز میں ہے

ظر ہوگی تو ہم تیشہ میں جوئے شیر دیکھیں گے
کفِ معمار میں بام و درِ تعمیر دیکھیں گے

محبت فرق کھو دیتی ہے اعلیٰ اور ادنیٰ کا
رُخِ خورشید میں ذرّہ کی ہم تنویر دیکھیں گے

بڑھے گا سلسلہ جب ارتباطِ ملک و ملّت کا
تو اس زنجیر کو اک روز عالمگیر دیکھیں گے

کریں گے تا بہ امکاں پردہ پوشی رازِ اُلفت کی
رہیں گی بند آنکھیں اور تری تصویر دیکھیں گے

کسی کو ہم نہ روندیں گے اگر راہِ ترقی میں
تو ہر اک خاک کے ذرّے کو دامنگیر دیکھیں گے

تری تقدیر میں لکھی ہے اے فرہاد ناکامی
دلائے گی تجھے کیا چیز جوئے شیر دیکھیں گے

پھریں گے تان کر سینہ اسی دم تک عدو اپنے
نہ جب تک ایک جا باہم کمان و تیر دیکھیں گے

کسی کی یاد آ آ کر مجھے تڑپا ہی جاتی ہے
شرارِ زندگانی کو مرے بھڑکا ہی جاتی ہے

کہاں سے طاقتِ دیدار لاتے حضرتِ موسیٰ
جب اُلفت دل میں ہوتی ہے نظر ٹھرا ہی جاتی ہے

نہیں چھپتا چھپانے سے ہنر در کا ہنر اے گل
تری بُو ساتھ لے گلشن میں صبا پھیلا ہی جاتی ہے

اگر کچھ سوز ہے دل میں تو خوبی حسنِ پنہاں کی
نگاہِ شوق کو اپنی جھلک دکھلا ہی جاتی ہے

نہیں محتاج ہے حرفِ بیاں کی فطرتِ شاعر
جو دل میں بات آتی ہے زباں تک آ ہی جاتی ہے

امید و شوق کا مسکن تمناؤں کی منزل تھا
کبھی یہ دل بھی اپنا دل کہے جانے کے قابل تھا

دلِ حسرت زدہ کس کو یقیں اس کا دلائیں ہم — کبھی اپنی امنگوں پر مدارِ اہلِ محفل تھا

مقامِ بے خودی تک لے گئے پہلے تمنا کو — قدم پھر جس طرف رکھا نشانِ راہِ منزل تھا

خدا جانے دعا تھی یا شکایت لب پہ بسمل کے — نظر سوئے فلک تھی ہاتھ میں دامانِ قاتل تھا

تری قدرت پہ حرف آتا ہے میں اس کو نہ مانوں گا — کہ یہ سارا جہانِ رنگ و بو اک نقشِ باطل تھا

جوانی جاتے ہی دستورِ سابق پر حیات آئی — بس اک دو روز کا ہنگامہ بیتابیٔ دل تھا

مگر آزادیٔ تخئیل دنیا کو نہیں بھاتی
جسے اس بزم میں دیکھا اسیرِ رنگِ محفل تھا

رمزِ الفت مثل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں — آج تک میں نے اُسے جی بھر کے دیکھا ہی نہیں

عشق پر موقوف کچھ دل کی تمنا ہی نہیں — قصۂ یوسف میں اک بابِ زلیخا ہی نہیں

ننگِ رسوائی ہو جس کو جذبۂ مجنوں نہیں — چھپ سکے جو پردۂ مینا میں صہبا ہی نہیں

اب یہ عصیاں ہے تو ہو میں کیا کروں مجبور ہوں — بات پر دل کی نہیں کرنا تو سیکھا ہی نہیں

دلدہی عاشق کی بھی کرتے تو کیا کچھ عیب تھا — ان سے لیکن کیا گلہ یہ رسمِ دنیا ہی نہیں

تولتے ہیں جنس میزانِ زیان و سود میں — دہر کے بازار میں الفت کا سودا ہی نہیں

پوچھتے ہیں لوگ بزمِ شعر میں یہ کون ہے
کیا کوئی اہلِ سخن اپنا شناسا ہی نہیں

یاد ہمدم نہ دلا عشق کے انسانوں کی — بات دیوانہ سے کرتے نہیں دیوانوں کی
حسنِ صورت پہ نہ ہوگی مے رحمت تقسیم — قدرِ گل دیکھ کے کی جائے گی پیمانوں کی
قفل اندر سے لگائے گئے زندانوں میں — اُف تمنائے اسیری ترے دیوانوں کی
نہ امیروں کو میسر نہ غریبوں کو نصیب — نیند بے خوف و خطر وہ ترے دیوانوں کی

جذبۂ عشق بھی اک صورتِ خود بینی ہے
ڈھونڈنا جلوۂ دل شکل میں بیگانوں کی

پھر ہوسِ نظارہ کر بزمِ جمالِ یار میں — پہلے نظر کو تاب دے آتشِ انتظار میں
ڈھونڈ رہا ہوں تجھ کو میں حسن کی ہر نمود میں — ہر گلِ تو پہ ہے نظر انجمنِ بہار میں
ایک جگر کا سوز و ساز کشمکشِ امید و یاس — ایک فسانۂ حیات دفن ہے ہر مزار میں
اشک تمام گر چکے نالے زباں تک آ گئے — کون تڑپ رہا ہے اب خاطرِ بے قرار میں
یا تو مری نظر میں اب صیقلِ آرزو نہیں — زنگ سا آ گیا ہے یا آئینۂ بہار میں

سختیٔ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
پھول تو کچھ کھلا دیے دامنِ کوہسار میں

غمخواریٔ سائل بھی تو انگر کو سکھا دے — دولت جنہیں دیتا ہے انہیں دل بھی خدا دے
صیاد ستم توڑ چکا اب تو رہا کر — بیداد ہوئی ختم تو اب دادِ وفا دے

رحمت تجھے کرنی ہے تو شایانِ کرم کر — دینا ہے تو یوں دے کہ امیدوں سے سوا دے
دردِ دلِ انساں اسے نغمے تو سنا دے — زاہد کو یہ فرصت بھی مگر یا خدا دے
ساقی کی نگاہوں میں تو مجرم نہ بنوں گا — ٹوٹیں گے تو ٹوٹیں مرے توبہ کے ارادے
کیا مصلحتِ حسن اجازت نہیں دیتی — تو جلوہ گہِ راز کے پردوں کو اٹھا دے
جلووں کی تمنا ہے تو اشکوں کو بہے جا — کچھ روز ابھی آئینۂ دل پہ جِلا دے

رو کے گی تجھے آپ تری غیرتِ تعمیر
تو پھر سے بنانے کے لیے چاہے مٹا دے

کبھی تو اے شاہدِ نہانی یہ پردۂ رنگ و بُو اٹھا دے
میں اپنی آنکھوں کو بند کر لوں تو اپنا جلوہ مجھے دکھا دے

کہاں ہے اے بلبلِ نوا سنج نالۂ درد چھیڑ ایسا
ہر ایک غنچہ کو اس چمن کے ترانۂ آرزو سنا دے

بھرا ہوا رنج و غم سے بیٹھا ہوں تو کہاں ہے رفیقِ صادق
یہ چارہ جو سا ہے نا سمجھ ہیں ذرا مجھے چھیڑ کر رُلا دے

وہ اور ہیں طالبانِ کوثر مرے لئے ساقیا فقط تو
ذرا سی اُلفت کی چاشنی لیکے شربتِ درد میں ملا دے

جگر ہیں جن کے ہے تابِ عصیاں وہی سمجھتے ہیں رازِ ہستی
رہِ طلب میں جو گامزن ہیں نہیں گے فرزیں وہی پیادے

تبسم گل کا منتظر ہے سرود جادو نوائے بلبل
کوئی نسیم سحر سے کہہ دے کہ جا کے غنچوں کو گدگدا دے

اصولِ ایماں حصولِ دنیا، فریبِ دانش خیالِ عزت
یہ سب اگر دل کا پاس کچھ ہے تو آتشِ عشق میں جلا دے

خرد کی آنکھوں کو بند کر اور دیکھ پھر جلوہ ہائے پنہاں
بہار تاروں کی لوٹنی ہے تو شمعِ خورشید کو بجھا دے

بہت میں بیباک ہو گیا ہوں کہیں نہ مستی میں کہہ اٹھوں کچھ
کسی بہانے یہی مناسب ہے بزم سے مجھ کو تو اٹھا دے

مجھ کو غمِ انساں کی حقیقت نظر آئی — دنیا ابھی محتاجِ محبت نظر آئی
آنکھوں میں ہے اک گورِ غریبانِ تمنا — ہر اشک میں اک شوق کی تربت نظر آئی
تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمہارا — مجھ کو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی
بلبل کے لئے چار طرف دام بچھے ہیں — ہر پھول میں صیاد کی نیت نظر آئی
آئینہ ہستی کو بہت غور سے دیکھا — مجھ کو تو کدورت ہی کدورت نظر آئی

تیرے پرِ پرواز میں اے طائرِ آزاد مرغانِ قفس کی مجھے طاقت نظر آئی
دی وعدۂ فردا کی مجھے اُس نے تسلّی مجھ کو یہ تسلی بھی غنیمت نظر آئی
پھر چھیڑنے آئیں انھیں خورشید کی کرنیں ذرّوں کی چمکتی ہوئی قسمت نظر آئی

تمہید کسی حسرتِ تازہ کی نہ ہو یہ
پھر آج اُمنگوں پہ طبیعت نظر آئی

دل ہے دیوانہ تو ناصح اس کو سمجھانے سے کیا
یہ کہاں کی عقل ہے لڑتا ہے دیوانے سے کیا

دو دلوں میں اب ہمیشہ کے لئے اک درد ہے
یا خدا ہوتا ہے دو نظروں کے مِل جانے سے کیا

ناتواں کی بے گناہی بھی نہیں آتی ہے کام
پیستی ہے آسیا کچھ پوچھ کر دانے سے کیا

حسن کے جلوے نہیں محتاجِ چشمِ آرزو
شمع جلتی ہے اجازت لے کے پروانے سے کیا

اپنے اشکوں کو بے جا کام آئیں گے ترے
یہ گہر اک کم نظر دنیا کو دکھلانے سے کیا

وسعتِ بزمِ جہاں میں ایک ساقی اک تو نیر

کام رندوں کا چلے گا ایک پیمانے سے کیا

اختلافِ دین و ملّت میں بھی ہے اک ربط سا

کچھ ورق سب پا گئے ہیں ایک فسانے سے کیا

ہر وہ ہے خاک کے ذرّے جو کرے زرنگار

اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

،دھوکے سے دیے کچھ مری بینائی نے — پھر اُسے ڈھونڈ نکالا دلِ ہرجائی نے

.اندازِ شوخی نے نہ رعنائی نے — حسن کو حسن کیا چشمِ تماشائی نے

لومعلوم مرا جذبۂ پنہاں نہ ہوا — ساتھ جب تک کہ دیا طاقتِ گویائی نے

ذرّہ پہ لکھا ہے مرا افسانۂ دل — پہلے تقصیر نے پھر ذوقِ جبیں سائی نے

ل کو پہونچی تری رعنائیِ حُسن — جو کسر تھی وہ مٹا دی تری انگڑائی نے

خلوتِ دل کے لیے بھی کوئی جلوہ رکھا

حسن تیری ہوسِ انجمن آرائی نے

دں دلِ پرشوق ہے اور کوئی حسیں ہے — یہ خواب کی باتیں کوئی سنتا تو نہیں ہے

مندکا کسی کی کوئی چارہ بھی کہیں ہے — اک بار زباں پر جو نہیں ہے تو نہیں ہے

مائل بہ ستم چرخ زمیں بر سرِ کیں ہے　　آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے

ایک جامِ شکستہ میں ہیں کچھ قطرۂ رنگیں　　اور جی میں ہے گویا کہ جہاں زیرِ نگیں ہے

دل مرکزِ احساس ہے ایذائے جہاں کا　　لگ جائے کہیں چوٹ مگر درد یہیں ہے

شک اُس کے کرم پر ہے گناہوں سے جھجکنا　　مومن تو وہی ہے جسے رحمت کا یقیں ہے

مایوس نہ ہو عشق، تغافل بھی ہے اک ناز　　خود حسن بھی اس کے لئے تیار نہیں ہے

مانا کہ وہ بے درد ہے بے مہر و وفا ہے　　سو بات کی اک بات تو یہ ہے کہ حسیں ہے

دم بھر کی نمائش ہے وہ قطرہ جو ہے گل پر　　جو خاک میں ملتا ہے وہی رزقِ زمیں ہے

صبر آنے کو آجائے مجھے حسرتِ دل پر　　لیکن یہ تقاضائے جوانی تو نہیں ہے

اک نغمۂ خوابیدہ ہے ہر سازِ جگر میں
اس بزم میں مضرابِ محبت بھی کہیں ہے

پیہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے　　ہر گام پر فریبِ منزل کا سامنا ہے

بحرِ حیات حسبِ ہمت نہیں ہر اک سو　　نظریں ذرا اُٹھیں اور ساحل کا سامنا ہے

تیرے حجاب کی بھی کچھ انتہا ہے آخر　　لیلےٰ کے بھیس میں بھی محمل کا سامنا ہے

ہنس ہنس کے تخم بو کر رخصت ہوئی جوانی
پیری ہے اور کشتِ حاصل کا سامنا ہے

ہینِ شیب، غرورِ شباب دیکھ لیا — جہاں کا سب سے بڑا انقلاب دیکھ لیا
رسکی نظرِ انداز ایک جلوہ بھی — تجھے بھی اے نگہِ انتخاب دیکھ لیا
سم کچھ تو کہو تم معاف گستاخی — وہی مثل ہے کہ گونگے نے خواب دیکھ لیا

بتا تو دو مجھے طرزِ ادائے سجدۂ شکر
کبھی دعا کو اگر مستجاب دیکھ لیا

کوئی نامہرباں اب مہرباں ہے — کہاں ہے عمرِ رفتہ تو کہاں ہے
ہجومِ یاس میں محصور جاں ہے — فریبِ آرزو کا امتحاں ہے
محبت ایک رسمِ دوستاں ہے — مگر اس دور میں رائج کہاں ہے
کوئی منزل نہیں راہِ طلب میں — وہی منزل ہے جس جا کارواں ہے
ہوس نکلے مگر پوری نہ نکلے — محبت کا یہی رازِ نہاں ہے
جو دل میں ہے وہی کہتا ہوں لب سے — جو لب پر ہے وہ نظروں سے عیاں ہے
قفس والے نہ گل دیکھیں نہ سبزہ — نظر جتنی ہے صرفِ آشیاں ہے
کیا اور پھر کیا عرضِ تمنا — محبت ہے تو خودداری کہاں ہے
جو اک نیلا سا دھبا دور پر ہے — اسیروں کی زباں میں آسماں ہے
گلِ خنداں ابھی غافل ہے شاید — وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے

گزرنا دیکھ کر رہ رو ادھر سے
کہیں ہر اک مزارِ بے نشاں ہے

یا یہی کہدے کہ راحت تری قسمت میں نہیں
مجھ کو دینا ہے تو دے آج قیامت میں نہیں

حرف گیری مری ہر بات پہ کرنے والے
کون سی بات ہے جائز جو محبت میں نہیں

شرحِ دل خاک کرے رسم کی پابند زباں
ہاں کی اکثر مترادف ہے محبت میں نہیں

دلِ بیتاب کا اندازِ بیاں ہے ورنہ
شکر میں کون سی شے ہے جو شکایت میں نہیں

کون کہتا ہے نظر آتے نہ بشکلِ راحت
آتے پھر آئے مگر خواب کی صورت میں نہیں

ایک کوتاہ نظر ایک ذرا دور اندیش
فرق کچھ زاہد و مے نوش کی نیت میں نہیں

اور کوئی امتحانِ عشق کی صورت نہ تھی حسن کے انکار میں انکار کی نیت نہ تھی

ری قسمت کہ نظروں میں تمہاری ہیچ ہے　　ورنہ یہ جنسِ وفا اتنی تو کم قیمت نہ تھی

شیخ مَیں اور ترکِ عصیاں وہ بھی جنّت کیلئے
جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنّت نہ تھی

رِ دورِ حاضر اتنا بتا رہے ہیں　　ہم جن کے منتظر ہیں وہ دن بھی آ رہے ہیں

شک سے نظر میں کچھ ڈبڈبا رہے ہیں　　بھولے فسانے شاید دہرائے جا رہے ہیں

ہے کامیابی اک عرضِ مدّعا کی　　اب وہ مری نظر سے آنکھیں چرا رہے ہیں

خونِ جگر کے قطرے اور اشک بن کے ٹپکیں
کس کام کے لئے تھے کس کام آ رہے ہیں

اضطرابِ روح

اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ ہر فردِ بشر
شاہ ہو یا بندۂ بیکس، غنی ہو یا فقیر
دہر کو اور اس کی چیزوں کو سمجھتا ہے حقیر
جلوۂ موہوم کی مشتاق رہتی ہے نظر

اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ عزّ و جاہ و مال
سب میسر ہیں مگر تسکینِ جاں ہوتی نہیں
آرزو جو دل میں ہے دل پر عیاں ہوتی نہیں
شوق دکھلاتا ہے اک دھندلی سی تصویرِ خیال

اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ انساں کی ہوس
لذّتِ کون و مکاں سے سیر ہوتی ہی نہیں
چاہتی ہے چھوڑ کر دنیا کو اڑ جائے کہیں
طائرِ دل کو جہاں معلوم ہوتا ہے قفس

اِک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ سامانِ عیش کے
سب بہم ہیں صحبتِ یاراں مگر بھاتی نہیں
شکلِ راحت بھی جمالِ شوق دکھلاتی نہیں
دل ترستا ہے نہ جانے کس تجلّی کے لئے
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی دلیل اس بات کی

خوابِ ہستی کے لئے بیداریٔ فردا بھی ہے
اپنی دنیا کے علاوہ اور اک دنیا بھی ہے
چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے جھلک جس کی کبھی
دل میں انساں کے جو اک کیفیتِ بیتاب ہے

کوئی جلوہ اور دامانِ عدم میں ہے نہاں
ختم دنیا پر نہیں ہے زندگی کی داستاں
روح کیا اپنے وطن کی یاد میں بیتاب ہے

انسان

کون ہے میرے سوا مالکِ افلاک و زمیں
نورِ فردا ہے نہاں جس میں وہ میری ہے جبیں
قصۂ دہر میں لیکن مجھے معلوم نہیں
اہرمن ہوں کہ سلیماں ہوں کہ خاتم کا نگیں

طورِ ہوں جذبۂ موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں میں
لبِ خاموش بتا دے یہ مجھے کون ہوں میں

مجھ پہ کھلتا ہی نہیں کچھ مری قسمت کیا ہے
پردۂ نقشِ ازل میں مری صورت کیا ہے
عقل کیا چیز ہے ارماں کی حقیقت کیا ہے
میں ہوں مخلوق کہ خالق مری فطرت کیا ہے

دستِ فرہاد ہوں یا تیشۂ فرہاد ہوں میں
آپ بہزاد ہوں یا خامۂ بہزاد ہوں میں

اپنی تقدیر کا بندہ بھی ہوں مختار بھی ہوں
طالبِ دید بھی ہوں کشتۂ دیدار بھی ہوں
دردِ الفت کا مسیحا بھی ہوں بیمار بھی ہوں
محفلِ دہر میں ساقی بھی ہوں میخوار بھی ہوں

بندگی دل میں کبھی ہے تو ہے الحاد کبھی
باغِ فردوس کبھی گلشنِ شدّاد کبھی

نورِ جاں پیکرِ خاکی میں فروزاں کیوں ہے　　مجھ میں پنہاں ہے تو پھر مجھ سے گریزاں کیوں ہے

جسم اور روح کا آپس میں یہ پیماں کیوں ہے　　عقل سے شوق مرا دست و گریباں کیوں ہے

دوست کس کو کہوں کس کو کہوں دشمن اِن میں

رہنما کون ہے اور کون ہے رہزن اِن میں

میں مدد غیر سے لوں یہ مرا دستور نہیں　　مثل پروانہ کے جینا مجھے منظور نہیں

گو شبِ تار ہے اور رہ میں کوئی نور نہیں　　میں جو بھٹکا بھی تو جاؤں گا بہت دور نہیں

میرے سینہ میں ہے عصیاں کی تجلّی باقی

دلِ مضطر کو ہے اتنی تو تسلّی باقی

وارثِ دہر کہیں یہ دلِ شیدا تو نہیں!　　خضرِ ظلماتِ جہاں نورِ تمنا تو نہیں!

زندگی نام کہیں ذوقِ طلب کا تو نہیں!　　رازِ ہستی دلِ عاشق کا تقاضا تو نہیں!

بحر کہتے ہیں جسے ہم کہیں ساحل ہی نہ ہو

راہ اب تک جسے سمجھے ہیں وہ منزل ہی نہ ہو

ترانۂ گنہگار

فطرتِ ناشکیب ہوں خاطرِ بیقرار ہوں — رُوحِ پُراضطراب ہوں دیدۂ اشکبار ہوں
کشتۂ آرزو ہوں میں، محوِ تلاشِ یار ہوں — سینۂ ریش ریش ہوں دامنِ تار تار ہوں
روزِ ازل سے طالبِ جلوۂ آشکار ہوں

میں ہوں شہیدِ جستجو تابِ دوام مجھ سے ہے — خندۂ صبح مجھ سے ہے گریۂ شام مجھ سے ہے
محفلِ روزگار کا حسنِ نظام مجھ سے ہے — لطفِ صراحی و مے و شیشہ و جام مجھ سے ہے
میکدۂ حیات میں کیفیتِ خمار ہوں

اہلِ طرب کے واسطے بزمِ نشاط خیز ہوں — طالبِ زخم کے لئے معرکۂ ستیز ہوں
میں ہوں کبھی شرر فشاں اور کبھی مشک بیز ہوں — گاہ میں فتنہ خیز ہوں گاہ میں نغمہ ریز ہوں
سیلِ رواں ہوں دشت میں باغ میں جوئبار ہوں

مجھ کو نہ دیر سے غرض اور نہ کچھ حرم سے کار — میری حیات سے مراد ایک ہے بس تلاشِ یار
میری امید و بیم کا اپنے ہی دل پہ ہے مدار — میں ہوں نہ طالبِ بہشت اور نہ خائفِ مزار
بوجھ ہوں خاک ہی کا میں اور نہ فلک کا بار ہوں

میری نظر وسیع ہے میرا خیال ہے بلند — خاطرِ نا صبور کو خوفِ مآل نا پسند
گوشۂ چشم میں نہاں صورتِ اشک تا بچند — چڑھ کے مژہ پہ ایک بار دیکھ لوں کشادو بند

یا تو سپردِ خاک ہوں یا دُرِ شاہوار ہوں

مجھ میں نہاں ترا وجود مجھ سے عیاں ترا ظہور — عکسِ سیاہ میں ترا، تو ہے مرا جمالِ نور
میری نظر پہ کس لئے ہے یہ حجابِ نزد و دور — ایک نہ ایک روز میں اس کو اُٹھاؤں گا ضرور

چشمِ پُر آرزو و بس پردۂ انتظار ہوں

ختم بس اک اڑان پر ہمتِ بال و پر نہیں — موت مری حیات کا خاتمۂ سفر نہیں
نورِ سحر کو ظلمتِ شام سے کچھ خطر نہیں — میری فنا فنا نہیں، مجھ کو خزاں کا ڈر نہیں

گلشنِ کائنات میں قافلۂ بہار ہوں

مجھ کو ہے دل سے ڈر یہی شوقِ وصال دیکھ کر — تاب نہ لا سکے گا یہ شکلِ خیال دیکھ کر
میری شکست ہے ضرور نورِ جمال دیکھ کر — آپ لرز رہا ہوں میں اپنا مآل دیکھ کر

ابرِ سیاہ کی مثال بر سرِ کوہسار ہوں

مجھ کو نہیں خطا کی شرم سامنے تیرے اے خدا — میں ہوں تری شبیہ ایک اس کو بگاڑ یا بنا
میرے لئے یہ ننگ ہے ڈھونڈوں کسی کا آسرا — میں ہوں نہ پیروِ مسیحؑ اور نہ مُریدِ مصطفا

اپنے ہی دوش پر لیے اپنی خطا کا بار ہوں

لذتِ درد کون دے لطفِ وصال کے لئے ‏ ‏ ‏ میں نے تو چھوڑ دی بہشت تابِ خیال کیلئے

رُوح مری ہے مضطرب اپنے جمال کے لئے ‏ ‏ ‏ جلوۂ دو جہاں ہے کم چشمِ سوال کیلئے

آرزوئے کلیم کی دہر میں یادگار ہوں

نقش بر آب ہوں مگر عشق کا راز دار ہوں ‏ ‏ ‏ ہوں تو ذرا سی مشتِ خاک برق سی ہمکنار ہوں

تو بھی بجھا نہ پائے گا جس کو میں وہ شرار ہوں ‏ ‏ ‏ ہستیِ بے ثبات ہوں جلوۂ پائدار ہوں

جس میں ہے شانِ کردگار میں وہ گناہگار ہوں

شاعر

جلوۂ حسنِ نہانی کا طلب گار ہوں میں
قصرِ دل جس نے بنایا ہے وہ معمار ہوں میں

آپ شیدا ہے جو اپنا وہ پرستار ہوں میں
اپنی تخئیل کے پھندے میں گرفتار ہوں میں

قسمتِ انساں کی مضمر مرے جذبات میں ہے
چشمۂ آبِ بقا میرے خیالات میں ہے

کب مری فکرِ رسا مائلِ افلاک نہیں
عزمِ پرواز پہ کب خاطرِ بیباک نہیں

طبع میری کبھی راغبِ سوئے خاشاک نہیں
میری تخمیر میں آمیزشِ گل خاک نہیں

عالمِ غیب کی آواز ہے کانوں میں مرے
رقصِ ہستی کی ہے جھنکار ترانوں میں مرے

محرمِ اسرارِ حقیقت کا کوئی ہے تو وہ میں
ترجماں دل کی حکایت کا کوئی ہے تو وہ میں

آئینہ حسن کی صورت کا کوئی ہے تو وہ میں
پرده ور خوبیٔ فطرت کا کوئی ہے تو وہ میں

جلوہ زن شاہدِ معنی مرے آہنگ سے ہے
رنگ سب گلشنِ ہستی کا مرے رنگ سے ہے

شکل تصویر میں لیلےٰ کی عیاں میری ہے — لبِ فرہاد پہ فریاد و فغاں میری ہے
اس میں بھی خوبیِٔ انداز بیاں میری ہے — نام مجنوں کا کیا جس نے زباں میری ہے

زیر و بم نغمۂ ہستی کا ہے تاروں پہ مرے
ہے نظر ایک زمانہ کی اشاروں پہ مرے

رہرِ شوق کی ہے کوئی منزل ہی نہیں — میں وہ دریا ہوں جو شرمندۂ ساحل ہی نہیں
جس کو کہتے ہیں سکوں وہ کبھی حاصل ہی نہیں — ایک آفت ہے یہ سینہ میں مرے دل ہی نہیں

اس کو جلوؤں سے فقط کام نگینوں سے نہیں
یہ وفا حسن سے کرتا ہے حسینوں سے نہیں

میرے سینہ میں ہے جب تک دلِ شیدا باقی — دل میں جب تک ہے تب و تابِ تمنا باقی
چشمِ ارماں میں ہے جب تک کوئی جلوا باقی — جستجو کا بھی رہے گا یہی سودا باقی

ساتھ لایا ہوں میں اپنے یہی تقدیر اپنی
ہاں ابھی یاد ہے وہ خلد کی تقصیر اپنی

طالبِ شمع ہوں مجھ کو جو مل جائے شرر — شمع مل جائے تو پیدا ہو خیالِ اختر
ہاتھ لگ جائے جو اختر تو ہو سودائے قمر — ماہ کے بعد رہے مہر کی خوبی پہ نظر

جو ٹھہر جائے کہیں پر وہ مری فکر نہیں
میرے مذہب میں قناعت کا کہیں ذکر نہیں

قیدِ دستور سے آزاد ہے فطرت میری　　مانتی ہی نہیں دنیا کی طبیعت میری
ایک عالم سے جدا ہے رہِ الفت میری　　میرے سینہ کی امنگوں میں ہے قسمت میری

منحرف مجھ سے زمانہ ہو تو کچھ دور نہیں
بات ٹل جائے مگر دل کی یہ منظور نہیں

داستاں عشق و محبت کی سناؤں کیوں کر　　مے الفت نہ پیوں خود تو پلاؤں کیوں کر
چہرۂ حسن سے پردے کو اٹھاؤں کیوں کر　　جلوہ دیکھوں نہ اگر خود تو دکھاؤں کیوں کر

قیمتِ تازگیٔ فکرِ سخن لیتا ہوں
اس میں کیا عیب ہے کچھ پھول جو چن لیتا ہوں

خاطرِ جمع بہ ایں راہ پریشاں کردم　　نقدِ جاں باختم و صدقۂ ایماں کردم
بود ہر آں کہ ز ہوش و خرد ارزاں کردم　　تا دلے را بکف آرم ہمہ قرباں کردم

بہ لبِ شوق بسے لذتِ تلخیست مرا
مایۂ زیست ہمیں سینۂ زخمیست مرا

آتشِ طورِ شرارِ غمِ دیرینۂ من
جامِ جمشید یکے پارۂ آئینۂ من

گر تو خواہی کہ بری فیض ز گنجینۂ من
لحظۂ چشم بگرداں طرفِ سینۂ من

"شاعرم حکم بہ پہنائے دو عالم دارم
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم دارم"

جامِ حیات

(کیفؔ)

دورِ گردوں کو مری مرضی پہ چلنا چاہیئے
اس کو میرے ہر اشارے پر بدلنا چاہیئے

آفتابِ زندگی دنیا ہے جس کی منتظر
اُس کو میرے مشرقِ دل سے نکلنا چاہیئے

مستحق ہو جائے گی پھر زیست کہلانے کی زیست
پہلے میرے شوق کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے

خونِ دل کا جوشِ ارماں میں تقاضا ہے یہی
داستانِ طور کی سُرخی بدلنا چاہیئے

پھر خزاں آئے تو آئے لیکن لے بادِ بہار
ایک دن شاخِ تمنا کو بھی پھلنا چاہیئے

چاہیے پھر بہہ جائے اس کے ساتھ خونِ زندگی
دل میں جو کانٹا چبھا ہے وہ نکلنا چاہیئے

شمع کی صورت اجل آئے تو جوشِ زیست میں
اپنے جلووں کی فراوانی سے جلنا چاہیئے

زندگی اُس کی ہے خطروں میں کٹی جس کی حیات
موت کی آغوش میں ہستی کو پلنا چاہیئے

بزمِ ہستی آرزوؤں پر مری تنظیم ہو
میرے پیمانے سے ہر میکش کو مے تقسیم ہو

(ے)

دل جلا کر سوزِ دل دنیا کو دکھلانے میں ہے — لطف جینے کا تڑپنے اور تڑپانے میں ہے

کہہ گیا پروانۂ جانبازِ رازِ زندگی — شعلۂ ہستی میں جل کر خاک ہو جانے میں ہے

جوئے شیرِ آرزو ہر دل میں ہے لطفِ حیات — اپنی جان تک کوہکن بنکر اُسے لانے میں ہے

سونگھ کر کوئی مسل ڈالے تو یہ ہے گُل کی زیست — موت اس کے واسطے ڈالی پہ کمہلانے میں ہے

حیف اس مے پر کہ رات آخر ہوئی اور وہ ابھی — انتظارِ رند میں لبریز پیمانے میں ہے

تو نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی ساحل نشیں — کیا مزا موجوں میں گھر کر غرق ہو جانے میں ہے

شاہراہِ عقل و دیں بیشک ہے بے خوفِ خطر — ہاں مگر لطفِ سفر اس سے بھٹک جانے میں ہے

اشک پی جانے میں لذّت ہے مگر اتنی کہاں — جو انھیں نوکِ مژہ تک لا کے ٹپکانے میں ہے

اپنے دل کی اپنے ارمانوں سے کر نشو و نما — ہاں نہالِ زندگی پنہاں اسی دانے میں ہے

چاندنی دل کی خرد کی دھوپ میں کھلتی نہیں — نور تاروں کا چراغِ مہر بجھ جانے میں ہے

پیاس شربت سے بجھانا ہے تو جا دیر و حرم — ہاں مگر جو چیز صہبا ہے وہ میخانے میں ہے

نورِ ہستی سامنے ہے چشمِ دل عُریاں تو کر
ایک بار او ڈرنے والے جرأتِ عصیاں تو کر

(دَرد)

وہ ارادے سب ترے جوشِ فراواں کیا ہوئے — اپنی دنیا خود بنا لینے کے ارماں کیا ہوئے

زیست ظالم زیست نے ایک ایک کر کے چن لئے — میری امیدوں کے وہ گلہائے خنداں کیا ہوئے

گوشۂ داماں تلک آئے فقط دو چار اشک — وہ متاعِ شوق کے لعلِ بدخشاں کیا ہوئے

جگمگاتی تھی کبھی اپنی بھی دنیائے خیال — ہائے وہ چشمِ تصور کے چراغاں کیا ہوئے

درد بڑھتا ہی گیا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ — درد کو درماں بنا لینے کے ساماں کیا ہوئے

عہدِ ہستی نے نہ دی فرصت کہ پڑھ لیں ایک شعر — حفظ تھے جو دل کو وہ دیواں کے دیواں کیا ہوئے

چار ہی دن میں ہوا تبدیل عنوانِ سخن — اے زبانِ عشق تیرے عہد پیماں کیا ہوئے

کچھ گلِ پژمردہ باقی ہیں فقط اب یادگار — وہ امنگوں کے پھلے پھولے گلستاں کیا ہوئے

ایک صحرا سی نظر آتی ہے ہر سو زندگی — وہ فریبِ آرزو کے کاخ و ایواں کیا ہوئے

رفتہ رفتہ ہو گئے آلائشِ عصیاں کی نذر — وہ عقیدے وہ اصولِ پاک ایماں کیا ہوئے

ہمت جوشِ جوانی بن گئی اب مصلحت — کیا ہوئے دنیا سے وہ لڑنے کے پیماں کیا ہوئے

خونِ دل کی کیفِ ہستی میں روانی اور ہے

زندگی کچھ اور ہے خوابِ جوانی اور ہے

تم مجھے بھول جاؤ گے

(۱)

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہ نہ سکے گا عمر بھر آج کا جوشِ اضطراب — آرزوؤں میں آئے گا کوئی ضرور انقلاب

پھر کوئی دوست ڈھونڈھ لے گی نگاہِ انتخاب — زیست سے زیست، دل سے دل، اور شباب سے شباب

عہدِ وفا ہے ایک خواب

تم مجھے بھول جاؤ گے

(۲)

تم مجھے بھول جاؤ گے

جس کی تجلیوں سے تھی بزمِ امید حشر خیز — جس کے تبسموں سے تھا سازِ حیات نغمہ ریز

جس کے نفس نفس سے تھی محفلِ دوش مشک بیز — رکھ کے کبھو جگر پہ ہاتھ آج بھی ہے وہی عزیز

وقت ہے کچھ عجیب چیز

تم مجھے بھول جاؤ گے

(۳)

تم مجھے بھول جاؤ گے

رسمِ جہاں ہے انقلاب، دور کا نام کائنات — دم کوئی لے سکے کہیں اتنا سکوں بھی دے حیات

آرزوؤں کی دل میں ہر ایک سجی ہوئی برات ایک نگاہ اک اُمنگ ایک امنگ ایک بات

ہستیِ عشق بے ثبات

تم مجھے بھول جاؤ گے

(۴)

تم مجھے بھول جاؤ گے

کوئی کسی کی یاد میں حشر تلک جیا نہیں تیرِ نظر کی چوٹ سے کوئی کبھی مرا نہیں

بن کے کھنڈ کون سا داغِ جگر اُڑا نہیں سنگِ لحد کو توڑ کر سبزہ کہاں اُگا نہیں

غم کوئی لا دوا نہیں

تم مجھے بھول جاؤ گے

(۵)

تم مجھے بھول جاؤ گے

پھر سے نگار خانۂ شوق کو تم سجاؤ گے پھر کسی بت کے واسطے فرشِ نظر بچھاؤ گے

آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے نام مرا اگر کوئی لے گا تو مسکراؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

دوشیزہ کا راز

آج کا دن زندگانی میں ہے میری بہتریں — اس کو میں سب سے الگ دل میں کروں گی جاگزیں
قدر کیوں اتنی ہے اس کی یہ بتاؤں گی نہیں — یہ مگر سچ ہے دلاتی ہوں تمہیں اس کا یقیں

دہر میں جب تک یہ صبحِ خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

تازگی بادِ صبا میں کل تلک ایسی نہ تھی — آسماں پر یہ چمک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
دل میں یہ ارماں نہ تھے ارماں میں یہ گرمی نہ تھی — ہاں مگر کل تک میں دل کی آرزو سمجھی نہ تھی

اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں
آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہو جاتا ہے کیوں

آج کا دن یہ تو ممکن ہے کہ ہو نازِ بہار — ختم اس پر ہے یہ مانا میں نے موسم کا نکھار
ہے نشاطِ قلب کا کچھ اور لیکن ذمہ دار — راز اپنا میں نہیں کرنے کی ہرگز آشکار

بات یہ بجز گل کسی کو میں نے بتلائی نہیں
رازداں ایسا ہے جس میں عیبِ گویائی نہیں

میں سمجھتی تھی نہ کل تک مدعائے زندگی   میرے کانوں تک نہ پہونچی تھی نوائے زندگی

مجھ سے پنہاں تھی شبیہ جانفزائے زندگی   عشق نے کھولے نہ تھے بندِ قبائے زندگی

دل مرا دنیا کی باتوں میں ذرا لگتا نہ تھا

آئینہ میں حسن تک اپنا بھلا لگتا نہ تھا

بے خبر فطرت سے اپنی خاطرِ معصوم تھی   یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی

آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی   کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہوگئی

کل تلک انگور تھی میں آج صہبا ہوگئی

کل بھی دل سینہ میں تھا اس بہ دلِ پُرخوں تھا   کل تلک میرے صدف میں گوہرِ مکنوں نہ تھا

کل بھی تھا مجھ کو مذاقِ زیست لیکن یوں نہ تھا   کوئی جادو تھا پیامِ دیدۂ مجنوں نہ تھا

دل میں ہوک اُٹھی لبوں پر مسکراہٹ آ گئی

رُخ پہ رنگ آیا نگاہوں میں لگاوٹ آ گئی

اب اُمنگیں اور ہیں جوشِ طبیعت اور ہے   زندگی کی خواب ارماں میں حقیقت اور ہے

گلشنِ ہستی کی اب نظروں میں صورت اور ہے   گُل کی نکہت اور ہے سبزہ کی رنگت اور ہے

کیا بتاؤں کون سا جلوہ مری آنکھوں میں ہے

اک نئی دنیا کا نظارہ مری آنکھوں میں ہے

مجھ سے کہتی ہیں مری ہم جولیاں اکثر یہی
مرد ہیں سارے کے سارے بیوفا، خود مطلبی
آج ہے جس کی خوشامد اُس سے کل ہو بےرُخی
اُن کے بہکانے میں آتی میں مگر ایسی نہ تھی

یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہ تھی
یا کبھی ان پر کسی کی طبع یوں آئی نہ تھی

خواہشِ محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر
پردہ داری کس لئے جذبات کی ہو اس قدر
اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چھپاتا ہے بشر
یا الٰہی کون سا الفت میں ہے ایسا اثر

تابِ خاموشی نہیں اور فکر چُپ رہنے کی ہے
شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

لو نہ جانے کیا کہے جاتی ہوں اپنے جوش میں
میں نہیں ہوں غالباً اس وقت اپنے ہوش میں
اب نہ آئے گی صدا میری کسی کے گوش میں
راز کو اپنے چھپاؤں گی لبِ خاموش میں

ہاں مگر جب تک یہ صبحِ خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

اقبال سے شکوہ

تو کعبہ کا دلدادہ تھا تو بت خانہ میں کیوں آیا
ے سے تجھ کو پرہیز اگر تھا مے خانہ میں کیوں آیا

لر تیری چشمِ باطن میں نورِ حسنِ صحرائی تھا
تو گلشن میں آکر پھر کیوں محوِ نغمہ پیرائی تھا

ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رِند پرانا آج نمازی بن بیٹھا

ے بلبل چھوڑ کے شاخِ گل کیوں خار و خس میں بیٹھا ہے
کیا ذوقِ اسیری ہے تجھ کو، جو جا کے قفس میں بیٹھا ہے

محمل میں چھپا ہے قیسِ حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبالؔ وہ اب دنیا میں نہیں

ے مطرب میرے ترانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں
وہ تازگیِ تخئیل نہیں بے ساختگیِ جذبات نہیں

تو بھول گیا اپنے نغمے کچھ فرق مرے کانوں میں نہیں

تاثیر جو دل پر کرتی تھی وہ لَے ہی تری تانوں میں نہیں

شوریدہ سری الفت کی گئی اب عقل کی ریزہ کاری ہے

فرہاد کی بیتابی کے عوض پرویز کی حیلہ سازی ہے

میں جس کا جویا ہوں گنجینہ میں تیرے گوہر وہ نہیں

سامان فریبِ عقل تو ہے جو دل میں چبھے نشتر وہ نہیں

اس گلشن سے تجھ کو نسبت اب جز نگہِ گلچیں نہ رہی

اب تیری زباں حق گو نہ رہی اب تیری نظر حق بیں نہ رہی

تیرے جامِ دل کی صہبا اب کوثر میں تبدیل ہوئی

مذہب کے ہاتھوں خون تری پاکیزگیِ تخئیل ہوئی

افسوس کہ تیری فکرِ فلک پیما کا یہ انجام ہوا

تُو تو فردوس کا طائر تھا کیوں آکے اسیرِ دام ہوا

تو وہ قطرہ تھا جو اشکِ اربابِ نظر بن سکتا تھا

تو جا کے صدف میں کیوں بیٹھا جب یونہی گہر بن سکتا تھا

تیری چشم کو تہ بیں میں ایماں کے سوا جلوا ہی نہیں

جو نورِ دلِ انساں میں ہے غافل تو نے دیکھا ہی نہیں

اب ہندو اور مسلماں کی دنیا کو کون ضرورت ہے

مذہب آئندہ نسلوں کا نوعِ انساں کی خدمت ہے

جس کو ایماں کہتا ہے تو برہان ہے تری نادانی کا

اللہ ترا کیا ہے اک نام فقط جہلِ انسانی کا

اپنی رسوائی کا باعث تعلیم یہ میں، اور تو، کی ہے

انسان کی ترقی کی دشمن تفریق یہ رنگ و بو کی ہے

میرا بس ہو تو ہر مسجد سے روئے زمین کو پاک کروں

ہر مندر کو مسمار کر دوں ہر ایک کلیسا خاک کروں

مذہب کی مینا کے قابل اے رند تری صہبا ہی نہیں

پوشاک جو تو نے پہنی ہے قامت پہ ترے زیبا ہی نہیں

آ محفل کو اپنا کر لے دیرینہ طرزِ سخن سے پھر

ہر لب پہ دعا آتی ہے یہی چھوٹے خورشید گہن سے پھر

محبّانِ وطن کا نعرہ

شہیدِ جورِ گلچیں ہیں اسیرِ خستہ تن ہم ہیں
ہمارا جرم اتنا ہے ہوا خواہِ چمن ہم ہیں

ستانے کو ستا لے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فردائے وطن ہم ہیں

ہمارے ہی لہو کی بو صبا لے جائے گی کنعاں
ملے گا جس سے یوسف کا پتہ وہ پیرہن ہم ہیں

ہمیں یہ فخر حاصل ہے پیامِ نور لائے ہیں
زمیں پہلے پہل چومی ہے جس نے وہ کرن ہم ہیں

سلائے گی ہمیں خاکِ وطن آغوش میں اپنی
نہ فکرِ گور ہے ہم کو نہ محتاجِ کفن ہم ہیں

بنا لیں گے ترے زنداں کو بھی ہم غیرتِ محفل
لیے اپنی نگاہوں میں جمالِ انجمن ہم ہیں

نہیں تیشہ تو سر ٹکرا کے جوئے شیر لائیں گے
بیابانِ جنوں میں جانشینِ کوہکن ہم ہیں

زمانہ کر رہا ہے کوششیں ہم کو مٹانے کی
ہلا پاتا نہیں جس کو وہ بنیادِ کہن ہم ہیں

نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ عہدہ ہے نہ طاقت ہے
مگر کچھ بات ہے ہم میں کہ جانِ انجمن ہم ہیں

ترے خنجر سے اپنے دل کی طاقت آزمانا ہے
محبت ایک اپنی ہے ترا سارا زمانا ہے

فدائے ملک ہونا حاصلِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے ہی کو ہم جنت سمجھتے ہیں

کچھ ایسے آ گئے ہیں تنگ ہم کُنجِ اسیری سے — کہ اب اس سے تو بہتر گوشۂ تربت سمجھتے ہیں

ہمارے شوق کی دارفتگی ہے دید کے قابل — پہونچتی ہے اگر ایذا اُسے راحت سمجھتے ہیں

نگاہِ قہر کی مشتاق ہیں دل کی تمنائیں — خطِ چینِ جبیں ہی کو خطِ قسمت سمجھتے ہیں

وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے — نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملّت سمجھتے ہیں

حیاتِ عارضی صدقے حیاتِ جاودانی پر — فنا ہونا ہی اب اک زیست کی صورت سمجھتے ہیں

ہمیں معلوم ہے اچھی طرح تابِ جفا تیری — مگر اس سے سوا اپنی حدِ الفت سمجھتے ہیں

غم و غصہ دکھانا اک دلیلِ ناتوانی ہے — جو ہنس کر چوٹ کھاتی ہے اُسے طاقت سمجھتے ہیں

غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم — نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں

دکھانا ہے کہ لڑتے ہیں جہاں میں باوفا کیونکر
نکلتی ہے زباں سے زخم کھا کر مرحبا کیونکر

بیسوا

خوار ہوں بدنام ہوں، رسوا سرِ بازار ہوں
خاطرِ نازک پہ اہلِ بزم کی اک بار ہوں
کوئی مونس ہی نہیں جس کا میں وہ بیمار ہوں
میں وہ گل ہوں جو زمانہ کی نظر میں خار ہوں

اہلِ دنیا مجھ سے تم اتنے خفا رہتے ہو کیوں؟
میں تو خود مظلوم ہوں مجھ کو بُرا کہتے ہو کیوں؟

سچ کہو تم نے کبھی اس بات کی پرسش بھی کی
قصۂ غم میرا سننے کی کبھی خواہش بھی کی
چشمِ رحمت میں مرے عیبوں کی گنجائش بھی کی
میرا دردِ دل سمجھنے کی کبھی کوشش بھی کی

قابلِ نفریں ہمیشہ مجھ کو سمجھا ہی کیے
مجھ پہ انگشتِ حقارت تم اٹھایا ہی کیے

مجھ کو دیکھو میں تمہارے عیب کا پردا رہی
آبرو والے رہو تم اس لئے رُسوا رہی
زندگی بھر اک دلِ ہمدرد کی جویا رہی
جائے عبرت ہے کہ میں محفل میں بھی تنہا رہی

جز ہوسناکی جہاں میں اور کچھ دیکھا نہیں
سینکڑوں عشاق کوئی چاہنے والا نہیں

کچھ غلط سمجھی ہے دنیا نے رہِ الفت مری ۔۔۔ دیکھتا کوئی نہیں محرومیِ قسمت مری
نورِ ظاہر میں نہاں ہے سوزشِ فطرت مری ۔۔۔ زندگی اس بزم میں ہے شمع کی صورت مری

شوق کی نظروں سے آخر تک مجھے دیکھا کیے
میں نے جل کر جان دی جلوا اُسے سمجھا کیے

مجھ سی بدقسمت زمانے میں کوئی لڑکی نہیں ۔۔۔ ماں کی الفت باپ کی صورت کبھی دیکھی نہیں
کون شے معصومیت ہے میں یہ سمجھی ہی نہیں ۔۔۔ میرے عہدِ زیست میں دیباچۂ طفلی نہیں

خاک دخوں میں گوہرِ فطرت مرا رُلتا رہا
حسن میرا گاہکوں کی آنکھ میں تُلتا رہا

جب مرادوں پر ذرا میرا شباب آنے لگا ۔۔۔ اک ذرا نظروں میں میری جب حجاب آنے لگا
کچھ سمجھ میں جب تمنا کا حساب آنے لگا ۔۔۔ جاگتی آنکھوں میں اک اُلفت کا خواب آنے لگا

مجمعِ عشاق میں سرگوشیاں ہونے لگیں
کھُل گیا نیلام میرا بولیاں ہونے لگیں

حسن کو تسخیر کرنے عشق بدبیں آ گیا ۔۔۔ اپنی نظروں میں لیے پیغامِ شیریں آ گیا
بوالہوس صیاد لے کر دامِ زرّیں آ گیا ۔۔۔ گُل ابھی کھلنے نہ پایا تھا کہ گلچیں آ گیا

آنکھ جب کھولی تو دیکھا آبرو باقی نہ تھی

وقت جب کھلنے کا آیا گل میں بو باقی نہ تھی

جب مرے حسن و جوانی سے دل اُن کے بھر گئے
یا جب اپنا نام و مال و زر و زر سب ہر گئے
اپنے اپنے عیب سارے میرے سر تھوپے دھر گئے
مجھ کو میرے چاہنے والے ہی رسوا کر گئے

بارِ عصیاں ایک عالم کا مری گردن پہ ہے
داغ یہ میرا نہیں ہے جو مرے دامن پہ ہے

دہر میں سب سے بڑا مجرم جو ہے وہ مرد ہے
بیوفائی میں ہے یکتا دلبری میں فرد ہے
لب پہ ہے اظہار بیتابی مگر دل سرد ہے
بے مروّت، خود غرض، پیماں شکن بیدرد ہے

آہ از تیرِ جفائے اُلفتِ بیباکِ او
ہم جو ما نخچیر صد ہا بستۂ فتراکِ او

مجھ سے اے پردہ نشیں حالت تری بہتر نہیں
گھر میں وہ کر بھی ترا مردوں کے دل میں گھر نہیں
آشنا پرواز کی لذت سے تیرے پر نہیں
مے سے پُر ہو کر بھی گردش میں ترا ساغر نہیں

آبرو میں نے تو کھوئی آب و دانے کیلئے
تو نے آزادی بھی کھو دی آشیانے کیلئے

مثل تیرے میں اسیرِ حلقۂ زنجیر ہوں
عورتوں کی بے کسی کی میں بھی اک تصویر ہوں
رحم کے قابل ہوں میں شرمندۂ تقصیر ہوں
مجھ سے یوں نفرت نہ کر میں بھی تری ہمشیر ہوں

گو ہرِ نسوانیت کے کچھ نشاں مجھ میں بھی ہیں
عیب ہیں مجھ میں جہاں کچھ خوبیاں مجھ میں بھی ہیں

پنے ہاتھوں اپنی ہستی کو مٹانا مجھ سے سیکھ　　ہنستے ہنستے آگ دامن میں لگانا مجھ سے سیکھ
زِ خاطر کو زمانے سے چھپانا مجھ سے سیکھ　　سینکڑوں غم لیکے دل میں مسکرانا مجھ سے سیکھ

زندگی اپنی مجھے گو اک نظر بھاتی نہیں
میری پیشانی پہ بھولے سے شکن آتی نہیں

ں کی درگاہِ کرم پر ایک سائل میں بھی ہوں　　گو کہ ہوں جامِ شکستہ زیبِ محفل میں بھی ہوں
نے ساقی کی نظر میں ظرفِ قابل میں بھی ہوں　　درد سے واقف ہوں میں بھی صاحبِ دل میں بھی ہوں

مجھ میں اور تجھ میں تجلّی ہے وہی مستور ایک
شمعِ محفل اور چراغِ خانہ میں ہے نور ایک

انقلاب زندہ باد

شوق ہوا بے حجاب　　ختم ہوا دورِ خواب
آگیا روزِ حساب　　قوم کا چمکا شباب

زندہ باد انقلاب

انقلاب زندہ باد

سُرخیِ عنوانِ ما　　جذبۂ پنہانِ ما
ہم دل و ہم جانِ ما　　گوہرِ دامانِ ما
آیتِ ایمانِ ما

انقلاب زندہ باد

فتنہ و شر تابہ کے　　دورِ قمر تابہ کے
طاعتِ زر تابہ کے　　خونِ ہنر تابہ کے
زیر و زبر تابہ کے

انقلاب زندہ باد

کب تلک اسیرِ محن کوہکنِ خستہ تن
خسروِ پُر مکر د فن خندہ زن و کام زن
طرحِ جہان بر فگن

انقلاب زندہ باد

جہلِ و کدورت مِٹا شان و رعونت مِٹا
جوشِ خصومت مِٹا زعمِ حکومت مِٹا
رنج و صعوبت مٹا

انقلاب زندہ باد

دور ہو سب ایک بار تفرقہ روزگار
مفلس و سرمایہ دار بندہ و با اختیار
کشمکشِ گیر و دار

انقلاب زندہ باد

توڑ پُرانا نظام دائرہِ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام دے یہ جہاں کو پیام
لے کے اخوت کا نام

انقلاب زندہ باد

پھر سے لگا اک چمن　　　سرو و گل و یاسمن
قمریِ شیریں دہن　　　جب ہو وہاں نغمہ زن
گونجے فضائے وطن

انقلاب زندہ باد

صبح ہو جب آشکار　　　از طرفِ کوہسار
گل کو سنائے ہزار　　　یہ خبرِ خوشگوار
وعدۂ فصلِ بہار

انقلاب زندہ باد

سہل کنِ مشکلات　　　قوم کی راہِ نجات
دہر کا رازِ حیات　　　فلسفۂ کائنات
لاکھ سخن ایک بات

انقلاب زندہ باد

بہار کی رات

آ مری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

(۱)

چشمۂ عشق بھی اگر — موج زناں رہے مدام
پہونچے نہ کچھ اسے ضرر — از گزرِ صباح و شام
پھر تو ضرور ہر بشر — بن کے رہے غلامِ عشق
اپنی حیات و جاہ و زر — وقف کرے بہ نامِ عشق
ایک ہی رنگ پر مگر — سوزشِ اندرِ دل نہیں
تاب و تبِ غمِ جگر — بے خبرِ سکوں نہیں

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات

ساتھ رہیں بس ایک رات

ہو وہ مگر بہار کی

آ مری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

(۲)

جب ہوئے یار دو جدا   نالہ کناں و اشک بار

سمجھے کہ زخم وہ لگا   اب نہ بچے گی جانِ زار

جب گئے چند دن گزر   آپ قرار آ گیا

جس پہ فدا تھی جاں نظر   گرد ہی یار آ گیا

اب وہ دل میں جوش ہے   اب وہ لب پہ آہ ہے

آتشِ جاں خموش ہے   شوق بھی کم نگاہ ہے

اس لئے اے مری حیات

مجھ کو پسند ہے یہ بات

ساتھ رہیں بس ایک رات

ہو وہ مگر بہار کی

آ مری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

(۳)

مل گئے دو حبیب جب　　پڑھنے لگے وہ بابِ عشق
صبح و مسا و روز و شب　　حفظ ہوئی کتابِ عشق
ہو گئی سیر جب ہوس　　کرنے لگے وہ خونِ عشق
بن گیا آشیاں قفس　　ختم ہوا جنونِ عشق
زیست کے سانحات میں　　رہ نہ سکا خمارِ عشق
کشمکشِ حیات میں　　خاک ہوئی بہارِ عشق

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی

آ مری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

(۴)

بنتے ہیں جو وفا شعار　　کہتا ہوں اُن سے صاف صاف

قول کا ان کے اعتبار　　مجھ کو نہیں خطا معاف

ایک سے تا بہ زندگی　　عشق بشر کی خو نہیں

ایک خدا کی بندگی　　مذہبِ آرزو نہیں

شوق میں جب ہوس نہیں　　پھر وہ نہیں عیارِ عشق

تاب کُن قفس نہیں　　طائرِ بے قرارِ عشق

اس لئے اے مری حیات

مجھ کو پسند ہے یہ بات

ساتھ رہیں بس ایک رات

ہو وہ مگر بہار کی

آ مری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

دل میں کھلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

مہاتما گاندھی کا خیر مقدم

یہ کس کی زیارت کا ہمیں آج شرف ہے؟ تعظیم میں کس ہستیِ اعظم کی یہ صف ہے؟
کیوں آج مرے لب پہ صداقت کا حلف ہے؟ کیا روئے سخن حضرتِ گاندھی کی طرف ہے؟
نکلے گی جو دل سے میں وہی بات کہوں گا
آج اپنے تصور سے ذرا کام نہ لوں گا

اے طبع تکلف ترا نبھنے کا نہیں آج انداز بیاں تیرا پنپنے کا نہیں آج
جز رنگِ صداقت کوئی جمنے کا نہیں آج مضموں کوئی الفاظ میں چھپنے کا نہیں آج
سب ساز الگ زینتِ تقریر کے رکھدے
آج اپنے کلیجے کو فقط چیر کے رکھدے

آمد ہے تری آج نشیمن میں ہمارے ہر چار طرف جشن ہے گلشن میں ہمارے
جو داغ تھے اب پھول ہیں دامن میں ہمارے انداز ترانے کا ہے شیون میں ہمارے
سینوں میں ہمارے ہے کبھی فخر کبھی شرم
گہ تیری طرف چشم ہے گہ اپنی طرف چشم

لذت تری باتوں میں ہے صہبائے وطن کی ہونٹوں پہ ہنسی ہے گلِ رعنائے وطن کی
آنکھوں میں تجلّی سی ہے زردائے وطن کی تو ایک جھلک ہے رخِ زیبائے وطن کی

ہستی پہ تری ناز ہو جتنا ہیں کم ہے
اس ملک کی قسمت ترے ماتھے پہ رقم ہے

تو معنیٔ انساں ہے حمیّت کی ہے تصویر تو شرحِ محبت کی، اخوت کی ہے تفسیر
امیدِ وطن کی تری ہمت پہ ہے تعمیر تو قوم کی تدبیر ہے تو ملک کی تقدیر

آنکھوں میں نہاں ہیں تری جلوے ابھی کچھ اور
برسے ہوئے بادل میں ہیں قطرے ابھی کچھ اور

اس خاک کو عزت ہے ترے نقشِ قدم سے صحرائے وطن رشکِ چمن ہے ترے دم سے
بڑھ کر ترا رتبہ ہے کسی قیصر و جم سے تو اپنے لئے کیا ہے یہ پوچھے کوئی ہم سے

از تو ہمہ دیوانگیٔ محفلِ ما ہست
تو شیشہ و تو ساغر و تو بادہ و تو مست

یاروں کو ابھی خواہشِ انعام بہت ہے کم حبِّ وطن ہے ہوسِ نام بہت ہے
دیوانگیٔ عشقِ بدانجام بہت ہے شوریدگیٔ ولولۂ خام بہت ہے

ہر لب پہ فقط اپنی ستائش کا سخن ہے

ہر پھول سمجھتا ہے وہی نازِ چمن ہے

تونے یہ سبق خدمتِ قومی کا سکھایا　　جو لب سے کہا پہلے اُسے کر کے دکھایا
یوں عشقِ زبانی تو بہت سب نے جتایا　　ہاں وقت پڑا جب تو تو ہی سامنے آیا

تیرا سا ہمیں چاہنے والا نہ ملے گا
ہمت کا دھنی قول کا سچا نہ ملے گا

تو صبر برتتا رہا دشمن کی جفا پر　　صدمے تجھے کیا کیا ہوئے غیروں کی خطا پر
آیا نہ کبھی حرف ترے صدق وصفا پر　　ہستی تری تفسیر ہے آئینِ وفا پر

تو اپنے عدو سے بھی کدورت نہیں رکھتا
پیمانۂ دل جز مئے الفت نہیں رکھتا

اک زیست وطن کیلئے قربان کی ساری　　اک زندگی انسان کی خدمت میں گزاری
پلّہ ہے تری ذات سے اس ملک کا بھاری　　مغرب سے کوئی جا کے کہے بات ہماری

تہذیب میں تیری ہے بشر بھی کوئی ایسا
ہے تیرے خزانے میں گہر بھی کوئی ایسا

موتی لال نہرو

موجزن ہونے لگا تھا جب ذرا دریاے قوم کچھ اثر جب کر چلا تھا نشۂ صہباے قوم
جب نظر آنے لگی تھی منزلِ فرداے قوم اُٹھ گیا دنیا سے اپنا رہنما لے واے قوم
پھول جب کھلنے کو تھے صحنِ چمن ویراں ہوا
مہر اپنا جب سحر ہونے کو تھی پنہاں ہوا

ہم نے تیرے واسطے سجدے کیے زاری بھی کی دست بستہ التجاے رحمتِ باری بھی کی
دوستوں نے ہو سکی جو نازبرداری بھی کی موت سے لڑنے کی تو نے آپ تیاری بھی کی
سب مگر بے سود نیت آسماں کی اور تھی
مصلحت اس کارسازِ دوجہاں کی اور تھی

اپنے خوں سے لکھ گیا تو سرخیِ عنوانِ قوم دھو گیا اپنے عمل سے دفترِ عصیانِ قوم
آفریں صد آفریں ہمت پہ تیری جانِ قوم مٹ کے راہِ قوم میں پورا کیا پیمانِ قوم
جان دینی ملک پر مر کر ہمیں سکھلا گیا
موت میں بھی ایک شانِ زندگی دکھلا گیا

جب مرتب ہوگا افسانہ ترا ہندوستاں　　نامِ نہرو سرخ حرفوں میں رقم ہوگا وہاں
عہدِ آزادی کی دو جلدوں میں ہوگی داستاں　　یعنی تیری اور جواہر کی سوانح عمریاں

کچھ تری باتیں ہیں کچھ تیرے پسر کا ذکر ہے
قوم کی تاریخ بھی تیرے ہی گھر کا ذکر ہے

ماؤں سے پوچھیں گے جب بچے وطن کے ہونہار　　ہندِ نو کا کون تھا پہلا مدبر باوقار
نقش کس کا اپنے سینوں میں بنائیں پائدار　　یک زباں ہوکر وہ تیرا نام لیں گی بار بار

مے رہے گی سب کے پیمانوں میں تیرے جام کی
مہر ہوگی سکۂ قومی پہ تیرے نام کی

مثل تیرے اب رموزِ سلطنت سمجھے گا کون　　ہاتھ نبضِ قوم پر تیری طرح رکھے گا کون
نقدِ جوشِ دل عیارِ قوم پر پرکھے گا کون　　طاقتِ پر خواہشِ پرواز میں تولے گا کون

تو ہی اک محرم تھا سب پردہ ہائے ساز کا
نغمہ سارا تھا تری گونجی ہوئی آواز کا

تیری فطرت میں نہاں تھا کون سا ایسا گہر　　ہاتھ جس ذرہ پہ رکھا وہ ہوا رشکِ قمر
بن گیا کھدر بھی تیرے جسم پر ملبوسِ زر　　عیب خوبی بن کے کھلتے تھے ترے انداز پر

اک ادائے دلبری تھی فتنہ سامانی تری
ایک شانِ خسروی تھی چینِ پیشانی تری

یوں طبیعت میں تری کیا کیا اُبال آتا نہ تھا
بحث میں کیا کیا تجھے غیض و جلال آتا نہ تھا
ہاں مگر دل میں کبھی تیرے ملال آتا نہ تھا
خاطرِ نازک کے آئینہ میں بال آتا نہ تھا
ایک ہی چھینٹے میں سب گردِ کدورت ڈھل گئی
اک گھٹا آئی، گھری، گرجی، برس کر کھل گئی

اپنے زخموں کے لئے تو طالبِ مرہم نہ تھا
جز خیالِ قوم تیرے دل میں کوئی غم نہ تھا
بے خبر فکرِ وطن سے تو کبھی اک دم نہ تھا
ہم کو ایک ایک دم ترا اک زندگی سے کم نہ تھا
تیرے خُم میں چار قطروں سے سوا باقی نہ تھا
ہاں مگر اُن کا بدل محفل میں اے ساقی نہ تھا

کون کہتا ہے ہمیں اس سانحہ کا غم نہیں
موت تیری اک بلائے ناگہاں سے کم نہیں
جہدِ آزادی میں لیکن فرصتِ یک دم نہیں
ہاں صفِ میداں کے شایاں محفلِ ماتم نہیں
اپنے سینوں میں ابھی جوشِ تمنّا ہے وہی
چشم پرنم ہے مگر تابِ تقاضا ہے وہی

ہد حبِ قوم کا باندھا ہے دل سے استوار　　اب تو آزادی مقدر میں ہے یا کُنجِ مزار

رہے ہیں لفظ یہ اپنی زباں پر بار بار　　پڑھ کے تیری لاش پر جاتے ہیں سوئے کارزار

شد فدا بر ملک تا نامِ وطن پائندہ باد

مُرد میرِ لشکرِ ما، میرِ لشکر زندہ باد

سنہ ۱۹۳۶ء

غزلیات

(۱)

تو خفا اور بہار کے دن ہیں
ارے ظالم یہ پیار کے دن ہیں

حسن کی سادہ لوحیاں ہیں ابھی
عشق پر اعتبار کے دن ہیں

گل غنیمت سمجھ یہ شور چمن
پھر سکوتِ ہزار کے دن ہیں

عہدِ شوخی کسی کا ختم ہوا
نگہِ شرمسار کے دن ہیں

مستیِ عشق ایک رات کی ہے
پھر شکستِ خمار کے دن ہیں

زیست اک نام دن گزرنے کا
ہم ہیں اور انتظار کے دن ہیں

ابھی پختہ نہیں جنونِ عشق
قلب پر اختیار کے دن ہیں

وہ بھی آتے ہیں بن کے نقش بہار
وہ جو خونِ بہار کے دن ہیں

اب تو بھولو حدیثِ دل ملّاؔ
یادِ پروردگار کے دن ہیں

(۲)

جل بجھی جب شمعِ دل پیغامِ شام آیا تو کیا
مرچکی جب پیاس ساقی لیکے جام آیا تو کیا

تابِ جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا
چشمِ موسیٰ بے کے عشقِ تشنہ کام آیا تو کیا

کردیا اک بار اس کا پیکرِ خاکی تو سرخ
خونِ دل گر خنجرِ قاتل کے کام آیا تو کیا

مدعائے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ
میرے ہونٹوں تک سوالِ ناتمام آیا تو کیا

اک نگاہِ خاص کا طالب ہوں تجھ سے ساقیا
جامِ مے مجھ تک بہ طرزِ فیضِ عام آیا تو کیا

گر چکی اک بار جب بجلی نگاہِ شوق پر
طور کی چوٹی سے پھر کوئی پیام آیا تو کیا

منزلِ گورِ غریباں کے نہ جاگے کچھ نصیب
صحنِ گلشن میں کوئی محشر خرام آیا تو کیا

ظرفِ سائل بھی بدل اے رحمتِ سائل نواز
مے سے پُر ان کانپتے ہاتھوں میں جام آیا تو کیا

پُر ہے تیرے ذکر سے اپنی حدیثِ زندگی
اس میں بھولے سے کہیں دل کا بھی نام آیا تو کیا

وہ نگاہِ تلخ جب خونِ تمنا کر چکی
پھر تصور میں کوئی شیریں کلام آیا تو کیا

خونِ دل ضائع نہ ہو مجھ کو تو اتنی فکر ہے
اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

ہیں ابھی خاکسترِ ملاؔ میں کچھ چنگاریاں
شعلۂ ہستی قریبِ اختتام آیا تو کیا

---

(۳)

یہی اک حُبِّ قومی کا اصولِ مختصر جانا

وطن کے واسطے جینا، نہ جی سکنا تو مر جانا

وفا سے دل نہ باز آنا، جفاؤں سے نہ ڈر جانا

نہ جینے دے تجھے دنیا تو مٹ کر نام کر جانا

کسی بیکس کی تربت ڈھونڈنے گورِ غریباں میں

جدھر کوئی نہ جاتا ہو اُدھر بھی لے نظر جانا

ہر اک صورت پہ دھوکا کھا رہی ہیں تیری صورت کا

ابھی آتا نہیں نظروں کو تا حدِّ نظر جانا

اسی کا نام جینا ہے جگر خوں ہو تو ہو جائے

نقوشِ دہر میں اک خاص اپنا رنگ بھر جانا

وہی میں ہوں، وہی دل ہے، وہی مایوسیاں ملاؔ

زمانہ کو فقط اک بات آتی ہے گزر جانا

(۴)

ہر شورشِ حیات سے بدظن بنا دیا — دنیا کو اہلِ امن نے مدفن بنا دیا

گلہائے شوق پھر بھی سمائے نہ چشم میں — حالانکہ ہر نگاہ کو دامن بنا دیا

لے ہی لیا اسیروں نے دیوانگی سے کام — زنداں میں سر کو پھوڑ کے روزن بنا دیا

وہ سنگدل ہیں نالہ بلب، عشق زندہ باد — آہن کو موم، موم کو آہن بنا دیا

اہلِ جہاں کی تنگ روی بھی عجیب ہے — جادہ سے جو ہٹا اُسے رہزن بنا دیا

یہ کس نے مسکرا کے نظر کی مری طرف — ہر وادیِ حیات کو ایمن بنا دیا

ہاں صبر خوب چیز ہے مانا مگر یہ کیا — اپنے ہی دل کا خود مجھے دشمن بنا دیا

میری نگاہِ شوق کی بے باکیاں نہ پوچھ — تیرے ہر اک حجاب کو چلمن بنا دیا

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری
یارانِ بے خبر نے اُسے فن بنا دیا

(۵)

فرقت میں دل کو ہم یوں ہی بہلائے جاتے ہیں
کیوں بے قرار ہے وہ ابھی آئے جاتے ہیں

ہ تیری بزم اور ترا رندوں سے یہ سلوک
ایک ایک بوند کے لیے ترسائے جاتے ہیں

ہ کہتے جاتے ہیں کہ نہ لاؤ گے تابِ دید
رُخ سے مگر نقاب کو سرکائے جاتے ہیں

ہلے تو تنگ تھے مرے نالوں سے ہم نشیں
اب چپ جو ہوں تو اور بھی گھبرائے جاتے ہیں

ہنا ہی غم فقط ہو تو ممکن ہے جھیل لیں
ہم اک جہاں کے درد پہ تڑپائے جاتے ہیں

ں ایک بار اور الٹ دو نقابِ رُخ
دیکھیں کہ اپنے ہوش میں ہم آئے جاتے ہیں

ہیں تھا کون سہل ترے در کا ڈھونڈنا
اور اس پہ جان بوجھ کے بہکائے جاتے ہیں

وئی تسلیوں کی کوئی انتہا بھی ہے
بچے بھی اس طرح نہیں بہلائے جاتے ہیں

لیدِ ہوش لب سے کیئے جا رہے ہیں اور
آنکھوں سے اک شراب سی برسائے جاتے ہیں

ہاں جانتے ہیں حضرتِ ملاؔ کو خوب ہم
شاعر تو وہ نہیں ہیں یہ کہلائے جاتے ہیں

(۶)

عمر کے دریا کے دریا بہہ گئے ‏ ‏ ہم جہاں ڈوبے وہیں پر رہ گئے

لب سے آنکھیں ملا کر رہ گئے ‏ ‏ چاہتے تھے چپ رہیں اور کہہ گئے

تم نے چھیڑا ہی نہ سازِ التفات ‏ ‏ میرے نغمے لب تک آ کر رہ گئے

دل میں آئے غم کے ایسے زلزلے ‏ ‏ کیسے کیسے کاخِ ارماں ڈھ گئے

فکرِ عقبیٰ اور اس دنیا کے بعد ‏ ‏ وہ بھی سہہ لیں گے جو یہ غم سہہ گئے

مے کشوں نے پی کے توڑے جامِ مے ‏ ‏ ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

نالۂ ملّا سے دنیا گونج اٹھی
اور نغمے دل ہی دل میں رہ گئے

(۷)

ظالم مری حیات کا دورِ شباب ہے
ہاں ہاں تری جفا پہ بھی جینے کی تاب ہے
اتنا بھی شک نہ میری محبت پہ کیجیے
یہ میں بھی جانتا ہوں زمانہ خراب ہے
کانٹے سے کم خلش میں نہیں وہ نظر مگر
جس کی جگہ ہو دل میں وہ کانٹا گلاب ہے
پھر غرقِ بحرِ یاس ہوئی کیا کوئی اُمنگ
چھوٹا سا ایک سطحِ نظر پر حباب ہے
نرمی سے دل کو چھیڑ ذرا سختیِ حیات
پہلا ابھی فریبِ تمنا کا خواب ہے

(۸)

کون سی تصویرِ ماضی سامنے آئی نہیں
اک مرقع زیست کا ہے شامِ تنہائی نہیں

اشک بن کر آئی ہیں وہ التجائیں چشم تک
جن کے کہنے کے لئے ہونٹوں میں گویائی نہیں

حسن کے بازار میں ہوتی نہیں کچھ اس کی قدر
سکّۂ اُلفت پہ جب تک مُہرِ رسوائی نہیں

یہ قفس کی تیلیاں سب شاخِ گل بن جائیں گی
جو نظر میں ہے ابھی تک وہ بہار آئی نہیں

عفو کے قابل ہے کیشِ مے کشاں میں ہر خطا
ہاں نہیں کوئی تو اک جرمِ شکیبائی نہیں

شمع پھر رکھتے ہیں ملّا میکدے آگے بزم میں
کیا ابھی دنیا مرے نالوں سے اُکتائی نہیں

(۹)

چلتی ہے بادِ حسرت یوں دل کی سرزمیں پر
تخمِ مُراد کوئی جمتا نہیں کہیں پر

دل میں جہاں کھٹک سی رہ رہ کے ہو رہی ہے
شاید رُکی تھی دم بھر ان کی نظر یہیں پر

عرشِ بریں پہ چمکا آج اک ستارہ
کس نے خلوصِ دل سے سر رکھ دیا زمیں پر

راہِ طلب میں مُلّا اس دُھن میں بڑھ رہا ہے
آخر ملیں گے جا کر ارض و سما کہیں پر

(۱۰)

دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد
اشک موتی ہیں مگر غم کی جِلا ہونے کے بعد
اپنے ہی جلوؤں کو باطل سے کیا منسوب خود
پردہ داری نے کسی کی خودنما ہونے کے بعد
گونجتی ہے یادِ ارماں کی صدائے بازگشت
بے صدا ہوتا نہیں دل بے صدا ہونے کے بعد
تا بہ دامن آئی اک بے رنگ سی پانی کی بوند
تھا ہی کیا آنسو ہیں صرفِ التجا ہونے کے بعد
مدعائے دل نہ پوچھو ڈال کر ابرو پہ بل
التجا آتی ہے لب تک آسرا ہونے کے بعد
وہ لیے کشتی لبِ ساحل ہے مُلّا منتظر
کون کب آواز دے شل دست دپا ہونے کے بعد

جواہر لال نہرو

(سنہ ۱۹۳۶ء میں کانگرس کا انچاسواں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس کے صدر
پنڈت جواہر لال نہرو دوبارہ منتخب ہوئے تھے وہ اسی وقت یورپ سے پلٹ کر آئے تھے)

وطن میں کون سردارِ چمن پھر بن کے آتا ہے
چمن کی سمت ارمانِ چمن پھر بن کے آتا ہے
رُخِ غم پر تبسّم کی کرن پھر بن کے آتا ہے
سوئے یعقوب بوئے پیرہن پھر بن کے آتا ہے

حکومت نے کیا تھا قید جس کو سرگراں ہو کر
وہی یوسف پھر آتا ہے امیرِ کارواں ہو کر

یہ جس کیاری کا گُل ہے اس کی پہچانی ہوئی بو ہے
مہک پھیلی ہوئی اس کی چمن بھر میں ہر اک سو ہے
خزاں کے دورِ حاضر میں یہی تسکیں کا پہلو ہے
یہی جانِ گلستاں ہے اسی کا نام نہرو ہے

دلوں پر نقش ہے اس کا زبانوں پر وظیفہ ہے
یہی وہ نام ہے جس کے سہارے قوم زندہ ہے

تری فرقت میں رنجیدہ تھے یارانِ کہن سارے
ترانے بھولتے جاتے تھے مرغانِ چمن سارے
لگے تھے جھلملانے سے چراغِ انجمن سارے
تری آواز کے تھے منتظر سازِ وطن سارے

جواہر لال نہرو

(۱۹۳۶ء میں کانگرس کا انچاسواں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس کے صدر
پنڈت جواہر لال نہرو دوبارہ منتخب ہوئے تھے وہ اسی وقت یورپ سے پلٹ کر آئے تھے)

وطن میں کون عمروارِ چمن پھر بن کے آتا ہے
چمن کی سمت ارمانِ چمن پھر بن کے آتا ہے

رُخِ غم پر تبسّم کی کرن پھر بن کے آتا ہے
سوئے یعقوب لیئے پیرہن پھر بن کے آتا ہے

حکومت نے کیا تھا قید جس کو سرگراں ہو کر
وہی یوسف پھر آتا ہے امیرِ کارواں ہو کر

یہ جس کیاری کا گُل ہے اس کی پہچانی ہوئی بو ہے
مہک پھیلی ہوئی اس کی چمن بھر میں ہر اک سو ہے

خزاں کے دورِ حاضر میں یہی تسکین کا پہلو ہے
یہی جانِ گلستاں ہے اسی کا نام نہرو ہے

دلوں پر نقش ہے اس کا زبانوں پر وظیفہ ہے
یہی وہ نام ہے جس کے سہارے قوم زندہ ہے

تری فرقت میں رنجیدہ تھے یارانِ کہن سارے
ترانے بھولتے جاتے تھے مرغانِ چمن سارے

لگے تھے جھلملانے سے چراغِ انجمن سارے
تری آواز کے تھے منتظر سازِ وطن سارے

ترا محفل میں آنا تھا کہ پھر منہ میں زباں آئی
رگوں میں پھر لہو دوڑا تنِ بیجاں میں جاں آئی

ترے دل میں تڑپ ہے ایک سوزِ غیر فانی کی — نظر میں اک تجلّی ہے شعاعِ زندگانی کی
ہنسی ہلکی سی ہونٹوں پر امیدِ کامرانی کی — قسم کھاتا ہے فردائے وطن تیری جوانی کی

انھیں ہاتھوں کھُلے گا اک نہ اک دن بابِ آزادی
تری صورت میں دیکھا ہے وطن نے خوابِ آزادی

نہیں رکھنے کا تو پائے جفا پر فرقِ حُرّیت — ستمگاری کے بیڑوں کو کیا ہے غرقِ حُرّیت
ترے خوں میں سرایت کر گئی ہے برقِ حُرّیت — وطن کو تو بنا دے گا کسی دن شرقِ حُرّیت

تو ہی اس دورِ طوفاں میں ہوا اپنا نُوحِ آزادی
ترے قالب میں کھنچ کر آگئی ہے روحِ آزادی

قریبِ اختتام آنے لگا ہے دورِ بربادی — مرے کانوں میں آتی ہے صدائے نغمۂ شادی
کہیں رُکنے سے رُک سکتی ہے اب تعمیرِ آزادی — ہر اک زنداں میں رکھ آیا ہے تو اک سنگِ بنیادی

ترے نقشِ قدم ہیں رزمگہ کے چپّہ چپّہ پر
ترے ایثار کی مہریں لگی ہیں ذرّہ ذرّہ پر

فطرت آزاد

مسکن ہے خاک میرا خود خاک سر بسر ہوں
دامِ حیات میں اک مرغِ شکستہ پر ہوں
پالا ہوا ہوں لیکن تاروں بھرے فلک کا
اس تیرہ خاکداں میں اک جلوۂ سحر ہوں
ہوں مشتِ خاک لیکن فردوس در نظر ہوں

سنہ ۱۹۳۷ء

(۱)

وہ غمِ جاں فزا دیا تو نے　　راحتوں کو بھلا دیا تو نے

کر کے روشن چراغ اشکوں کے　　رُوح کو جگمگا دیا تو نے

دل کا ہر تار لرزہ بر اندام　　کون نغمہ سنا دیا تو نے

اپنی ہی بات اور کہہ نہ سکوں　　جیسے گونگا بنا دیا تو نے

کیا میں سمجھوں سوالِ دل کا جواب　　پھر وہی مُسکرا دیا تو نے

لطفِ احباب تک ہے دل پر بار　　کتنا نازک بنا دیا تو نے

آنکھ جس کی جہاں لگی غمِ زیست　　وہیں شانہ ہلا دیا تو نے

تب کہیں لب تک آئی دل کی بات　　جب ذرا آسرا دیا تو نے

پیاس چشمِ کرم بجھائی خوب　　اور پیاسا بنا دیا تو نے

مجھ سے لے کر مرا سکون و قرار　　اس کے بدلے میں کیا دیا تو نے

گم تھا جو ساز دل کے تاروں میں　　وہی نغمہ سنا دیا تو نے

مجھ سے جب تک ملا نہ تھا ملاؔ

کیا تھا اور کیا بنا دیا تو نے

(۲)

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمہیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی یاد تمہیں نہ آ سکے

زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے
لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مسکرا سکے

نام ترا کیا ہے نقش میں نے اسی دعا کے ساتھ
دل سے نہ مٹ سکے کبھی لب پہ کبھی نہ آ سکے

پاس کا خیر ذکر کیا دور بھی اُس کو ناگوار
ہم تو حریم دوست میں کوئی جگہ نہ پا سکے

میری اِنھیں کھُلی ہوئی آنکھوں میں ایک خواب ہے
کاش کہ اس کی اک جھلک تیری نظر بھی پا سکے

حسرتِ عشق پر ہمیں صبر کبھی نہ آ سکا
دل کو تو غم بنا لیا، غم کو نہ دل بنا سکے

قفل سا اک زباں پہ تھا، آنکھ میں کچھ نمی سی تھی
ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے

اپنے ہی شوق کی خطا، اپنی ہی آنکھ کا قصور
وہ تو اُٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اُٹھا سکے

جب ہمیں مٹ گئے تو پھر تیری جفا کا لطف کیا
ناز اسی قدر روا جتنے کوئی اُٹھا سکے

اور تو تیرے عشق میں ہم نے کوئی کمی نہ کی
اتنی خطا ضرور کی ہنس کے نہ چوٹ کھا سکے

عشق اگر کیا تو دیکھ عشق کی آبرو نہ جائے
ہوش نہ کھو، جو کھو تو یوں ہوش میں پھر نہ آ سکے

ملا ارے یہ کیا کیا عشق اور اس صنم سے عشق
آگ لگا تو وہ لگا جس کو کبھی بجھا سکے

(۴)

چھپ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ
آ یہاں تو مری ترسی ہوئی آغوش میں آ

اور دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
اے مرے دل کی تمنا لبِ خاموش میں آ

مےِ رنگیں پسِ مینا سے اشارے کب تک
ایک دن ساغرِ رندانِ بلا نوش میں آ

عشق کرتا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
یا تو بیہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ

تو بدل دے نہ کہیں جوہرِ انساں کا بھی رنگ
اے زمانے کے لہو دیکھ نہ یوں جوش میں آ

دیکھ کیا دام لگاتی ہے نگاہِ ملاؔ
کبھی اے غنچۂ تر دستِ گل افروش میں آ

(۴)

مٹا بھی ہیں تو رہے گا غمِ وطن باقی — کہ آشیانہ جلا بھی تو ہے چمن باقی
رہی اگر یہی تفریق تو و من باقی — تو کوئی گل ہی رہے گا نہ پھر چمن باقی
فروغِ محفلِ ماضی کی یادگارِ خموش — نظر میں ہے فقط اک اشکِ بے سخن باقی
ادائے عرضِ تمنا میں رک رہی ہے زباں — کسی جبیں پہ ہے شاید کوئی شکن باقی
نظامِ دہر کی بنیاد اس اصول پہ ہے — کہ اس میں فرد تو فانی ہے انجمن باقی
عمل عمل ہی رہے گا صلہ ملے نہ ملے — زبانِ خلق پہ ہے نامِ کوہکن باقی
سیاہ خانۂ دل کی طرف بھی بزم نواز — تری نظر میں اگر ہو کوئی کرن باقی
یہی ہے رسمِ چمن گل نہ کر صبا سے گلہ — نہ رہ سکا کسی یوسف کا پیرہن باقی
وہ کب کے بزم میں آئے بھی اور چلے بھی گئے — نظر نظر میں ہے لیکن سخن سخن باقی
نہیں ہے دل میں تمنا تو کیوں ہے ناکامی — کہ آفتاب تو غائب ہے اور گہن باقی

وہ صدق دل سے کرے لاکھ عذرِ عجزِ سخن
ہے پھر بھی بزم کو ملاؔ سے حسنِ ظن باقی

(۵)

یوں ہی اُٹھ جانے کا ئیں لے ساقیِ محفل نہیں
یا تو بھر ساغر مرا یا کہدے اس قابل نہیں

بے قراری سی تمنا میں اگر شامل نہیں
دل تو ہے لیکن مذاقِ عشق کے قابل نہیں

وہ تغافل کیش اُلفت سے کبھی غافل نہیں
التجا نا کام دل کی سعیِ لا حاصل نہیں

کون مانے گا یہی دل مرکزِ احساس تھا
یہ جو اب پتھر کہے جانیکے بھی قابل نہیں

وہ تغافل کی نظر جانِ توجہ بن گئی
میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کہ میں مائل نہیں

خوب ہے ضبط تمنا ہاں مگر کچھ حد بھی ہے
اب تو مدت سے نظر تک رازدارِ دل نہیں

اشک تو وہ ہے جو دامن کو بنا دے لالہ زار
آستیں کا داغ بن جانا تو کچھ مشکل نہیں

رہروِ صادق اُٹھاتا ہے قدم کس شوق سے
ہاں مگر جب تک نظر کے سامنے منزل نہیں

اک جنوں ہے عشق ملاؔ اور اک دھوکا ہے حسن
یہ سمجھ کر بھی تو آساں زیست کی مشکل نہیں

(۶)

بس شرط ہے اتنی کہ ہم آواز کوئی ہو
میں نغمے سناؤں گا تجھے، ساز کوئی ہو

کیوں پھیروں نگاہوں کو میں اے جلوۂ پیہم
جب راز ہی کھلنا ہے تو غمّاز کوئی ہو

تو چھپ نہیں سکتا ہے کرم کر کہ ستم کر
تو تو ہی رہے گا ترا انداز کوئی ہو

نالوں کو ترستے ہیں وفادارِ محبّت
اتنا بھی نہ اب گوش بر آواز کوئی ہو

ملّا یہی آتی ہے ہر اک قبر سے آواز
انجام وہی ایک ہے آغاز کوئی ہو

(۷)

جتنا کہ نگاہوں سے عیاں رازِ جگر ہے
تکمیلِ وفا میں ابھی اُتنی ہی کسر ہے

کچھ اپنی کشش کی بھی تجھے حسن خبر ہے
یا یوں ہی ہر اک آنکھ پہ الزامِ نظر ہے

رہرو تو وہی ہے جسے منزل کی خبر ہے
اور یوں تو گنانے کے لئے قافلہ بھر ہے

جس عہدِ وفا کے لئے بے صوت ہیں الفاظ
اُس کے لئے آئینِ محبت میں نظر ہے

اک آن میں مٹ جائیں گے شکوے بھی گلے بھی
ان سب کے لئے ایک محبت کی نظر ہے

ملّا کی نہ پوچھو کہ وہ پروردہِ افلاک
ہے خاک مگر عالمِ بالا پہ نظر ہے

(۸)

دل بجھا شمعِ کائنات گئی — زندگی کی اجالی رات گئی

عشق میں کیا سوالِ خودداری — جانے کے بار اپنی بات گئی

سازِ دل بے صدا سا کیوں نہ رہے — کیوں تری ضربِ التفات گئی

تلخیِ غم کی لذتیں تو ہیں — لب سے شیرینیِ حیات گئی

عشق سے آرزو کو یہ تو ملا — وہ جو تھی قیدِ ممکنات گئی

پھر نہ معلوم کیا ہوئے میرے اشک — ہاں نظر تک تو اک برات گئی

اندھا کیا جانے روشنی کیا ہے — آئی ہی کب تھی جو حیات گئی

فصلِ گل اب بھی ہے جنوں انگیز — ہاں وہ پہلے کی سی تو بات گئی

بات ملاؔ کہو تو صاف کہو
اب وہ رسمِ تکلفات گئی

(۹)

بے رنج کے خوشی کا بھی ساماں نہ ہو سکا — کانٹوں سے بے نیاز گلستاں نہ ہو سکا

اک ربطِ باہمی کا جو امکاں نہ ہو سکا — گل جمع بھی ہوئے تو گلستاں نہ ہو سکا

تسلیم برگِ گل تری رنگینیاں مجھے — تجھ سے مگر جوابِ گریباں نہ ہو سکا

اک عرضِ شوق ہی پہ فقط منحصر نہیں — ہم سے کوئی بھی کارِ نمایاں نہ ہو سکا

گو ہر قدم پہ پھول کھلاتی رہی امید — دشتِ حیات پھر بھی گلستاں نہ ہو سکا

دی تھی کسی کی یاد کو جا میں نے ایک بار — پھر اس کے بعد دل کبھی ویراں نہ ہو سکا

سمجھا ہے شیخ ترک کو معراجِ بندگی — ناداں گناہ کر کے پشیماں نہ ہو سکا

ملّائے بے نیاز ارے ملّائے بے نیاز
تیرے بغیر نازِ حسیناں نہ ہو سکا

(۱۰)

تھرکی کیوں نگاہ ہے پیارے — کیا محبت گناہ ہے پیارے

دل کو اپنی ہی جلوہ گاہ سمجھ — آ نظر فرشِ راہ ہے پیارے

پھیر لی تونے جب سے اپنی نظر — میری دنیا سیاہ ہے پیارے

شک بھی کس پر مری محبت پہ — جس کا تو خود گواہ ہے پیارے

تیری معصوم سی نظر کی قسم — یہی وجہِ گناہ ہے پیارے

دو نگاہیں جہاں پہ مل جائیں — عشق کی شاہراہ ہے پیارے

منھ جو سی دیتی تھی شکایت کا — اب کدھر وہ نگاہ ہے پیارے

جو بظاہر نہیں مری جانب — وہ نظر بے پناہ ہے پیارے

سچ بتا کچھ خفا ہے تو مجھ سے — یا حیا سدِ راہ ہے پیارے

اجنبی بن رہی ہے تیری نظر — ختم کیا رسم و راہ ہے پیارے

راہِ الفت میں ٹھہرنا کیسا — دم بھی لینا گناہ ہے پیارے

دل سی شے اور نا پسند تجھے — اپنی اپنی نگاہ ہے پیارے

نیک ارادوں کے سنگریزوں پر   شاہراہِ گناہ ہے پیارے

لب پہ آتی ہے جو ہنسی بن کر   ایک ایسی بھی آہ ہے پیارے

عشق میں وہ بھی ایک وقت ہے جب   بے گناہی گناہ ہے پیارے

اور ملّا کو کیا مٹاتے ہو

وہ تو یونہی تباہ ہے پیارے

(۱۱)

پیری کا ترنّم بھی اک مرثیہ خوانی ہے
نغمہ تو جبھی تک ہے جب تک کہ جوانی ہے

اشکِ غمِ الفت میں اک رازِ نہانی ہے
پی جاؤ تو امرت ہے بہہ جائے تو پانی ہے

ہاں زیست کی فصلوں میں اک فصل جوانی ہے
جو دن ہے سنہرا ہے، جو شب ہے سہانی ہے

دل ڈوب گیا ہوتا جوشِ غمِ فرقت سے
آنسو نہیں آنکھوں میں اُلجھا ہوا پانی ہے

ہنستی ہوئی محفل کو کس دل سے رُلائیں ہم
کہتے نہیں بنتی ہے اور اپنی کہانی ہے

برسے ہوئے اشکوں کی آنکھوں میں کھٹک سی ہے
آغاز ہے پیری کا اور یادِ جوانی ہے

شاید تمہیں یاد آئے اک عہدِ گزشتہ کی
ہاں ہاں اسی دیوانے ملاؔ کی کہانی ہے

(۱۲)

جفا صیّاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی
قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی

یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا
تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلّی درمیاں کر دی

تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی

اسیر آنکھیں کہاں سے سیرِ گلشن کے لیے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرفِ تلاشِ آشیاں کر دی

محبت کو کسی نے بے نیازِ دو جہاں کر کے
کفِ سائل میں پنہاں دولتِ ہر دو جہاں کر دی

بجز اشکوں کے عنواں کے نہ تھا کچھ سازِ شامِ غم
کسی کی یاد آئی اور مکمل داستاں کر دی

خرد کی مدتوں کی محنتوں پر گر پڑی بجلی
کسی نے ہنس کے سوئے دل نظر پھر ناگہاں کر دی

جبیں بے نور ہے میری تو کیا وہ در تو روشن ہے
کرن ہر ایک ماتھے کی نثارِ آستاں کر دی

وہی ہے مردِ رہرو خارزارِ زیست میں جس نے
ذرا آسان تر پہلے سے راہِ کارواں کر دی

وہی اک شامِ الفت حاصلِ ہستی ملا ہے
جسے دنیا سمجھتی ہے کہ اس نے رائگاں کر دی

(۱۳)

کب تک کسی سے مانگ کے ہم اختیار لیں
اب جی میں ہے کہ شہر سے لڑ کر کچھار لیں
کس کو رہا ہے وعدۂ فردا کا اب یقیں
دنیا کا آپ جائزۂ اعتبار لیں
اپنا بنائیں دل کو جو دل کے نہ بن سکیں
جو اختیار دے نہ سکیں اختیار لیں
ہاں دوسرے کا درد ہے پھر دوسرے کا درد
لینے کو اپنے دل پہ اثر ہم ہزار لیں
تسکینِ دل کی پھر کوئی صورت بتائیں آپ
جب نام بھی نہ آپ کا ہم بے قرار لیں
دونوں کو ساتھ گوندھ سکیں جب تو لطف ہے
اک تار زندگی کا لیں اک دل کا تار لیں

(۱۴)

بھولے سے بھی لب پر سخن اپنا نہیں آتا ہاں ہاں مجھے دنیا میں پنپنا نہیں آتا

دل کو سرِ الفت بھی ہے رسوائی کا ڈر بھی اس کو ابھی اس آنچ میں تپنا نہیں آتا

یہ اشکِ مسلسل ہیں محض اشکِ مسلسل ہاں نام تمہارا مجھے جپنا نہیں آتا

تم اپنے کلیجہ پہ ذرا ہاتھ تو رکھو کیوں اب بھی کہو گے کہ تڑپنا نہیں آتا

مے خانہ میں کچھ پی چکے کچھ جام بکف ہیں ساغر نہیں آتا ہے تو اپنا نہیں آتا

زاہد سے خطاؤں میں تو نکلوں گا نہ کچھ کم ہاں مجھ کو خطاؤں پہ پنپنا نہیں آتا

بھولے تھے انھیں کے لئے دنیا کو کبھی ہم اب یاد جنھیں نام بھی اپنا نہیں آتا

دکھ جاتا ہے جب دل تو ابل پڑتے ہیں آنسو
ملاؔ کو دکھانے کا تڑپنا نہیں آتا

۱۵

گنگا کی لہر ہے یہ مری چشمِ نم نہیں
جس دل میں درد ہے کسی کعبے سے کم نہیں
کیوں کر کہوں تمہاری جفاؤں کو میں جفا
جو دل کو راس آئے ستم وہ ستم نہیں
تخمیرِ عشق میں نہیں سودائے انتقام
تیری جفا پہ آہ کریں جو وہ ہم نہیں
راہِ طلب میں شوق کی دیکھو سبک روی
ڈالے کہیں جو نقش وہ اس کا قدم نہیں
اپنی زباں سے کیوں کہو مجھ کو گدائے در
اپنی عطا پہ نازِ یہ شانِ کرم نہیں
یہ اور بات ہے کہ نہ دو دل میں تم جگہ
لیکن نظر چرانے کے قابل تو ہم نہیں
ملّا کہیں بتوں کو ہٹانے ہی سے نہ ہو
کیوں اب وہ زیب و زینتِ طاقِ حرم نہیں

شبِ ہجر اور تنہائیاں ہیں — تری یاد سے بزم آرائیاں ہیں

سکوں ایک دنیا پہ چھایا ہوا ہے — خموشی کی ہر سمت دارائیاں ہیں

کسی بے خبر سونے والے سے تاباں — مری آرزوؤں کی تنہائیاں ہیں

کہیں خوابِ نوشیں سے چونکے نہ کوئی — تمنا کی کیا کیا سبک پائیاں ہیں

مرے سامنے جیسے وہ جلوہ گر ہیں — وہی ناز، انداز، رعنائیاں ہیں

لبوں پر ہے اک ہلکا ہلکا تبسم — تبسم میں کیا کیا دل افزائیاں ہیں

نگاہوں سے ہیں میری جانب اشارے — اشارے نہیں ہیں مسیحائیاں ہیں

تمنائے مردہ میں جان آ رہی ہے — امیدِ فسردہ میں رعنائیاں ہیں

پھر انگڑائیاں لے رہی ہیں امنگیں — نگاہ و جگر میں توانائیاں ہیں

نہ مرعوب ہو کر مری بے زبانی — نہ مجبور ہو کر شکیبائیاں ہیں

مزے سے مری اُن کی ہوتی ہیں باتیں — کہ جیسے کہیں کی شناسائیاں ہیں

کبھی عشق کی ہے نیاز آفرینی — کبھی حسن کی ناز فرمائیاں ہیں

کوئی سننے والا نہ ٹھہرانے والا — نہ غمّاز کوئی نہ رسوائیاں ہیں
کوئی در ہے اور میں نہیں اور کوئی — جبیں سائیوں پر جبیں سائیاں ہیں
چلے آرہے ہیں لبوں پر ترانے — بھری جیسے سینہ میں شہنائیاں ہیں
کبھی شوقِ گستاخ کی یورشیں ہیں — کبھی خود خجل ہو کے پسپائیاں ہیں
نہیں ہے کوئی دل کو سمجھانے والا — وہ عالم ہے معزول دانائیاں ہیں
وہاں روح جا جا کے ٹکرا رہی ہے — جہاں قلبِ انساں کی گہرائیاں ہیں
محبّت کی باتیں تصور کو سونپیں — تصور پہ قربان گویائیاں ہیں

نہ کر اِن کا پیچھا ارے جاگ ملّاؔ
یہ سب خوابِ ارماں کی پرچھائیاں ہیں

ہم لوگ

سُرخیِ انقلاب ہیں ہم لوگ
عنفوانِ شباب ہیں ہم لوگ

تیرہ و تار غم کی راتوں میں
مژدۂ آفتاب ہیں ہم لوگ

چشمِ حسرت میں تشنہ کاموں کی
خوابِ جام و شراب ہیں ہم لوگ

موت کے حملہ ہائے پیہم پر
زندگی کا جواب ہیں ہم لوگ

سونے والوں کو کر دیا بیدار
اک پریشاں سا خواب ہیں ہم لوگ

کون آنکھیں ملائے گا ہم سے
جلوۂ بے نقاب ہیں ہم لوگ

قوم کا دل ہلا دیا ہم نے
نالۂ مستجاب ہیں ہم لوگ

موجِ دریا پہ چھائے جاتے ہیں
کاروانِ حباب ہیں ہم لوگ

جن کے مٹنے میں بھی ہے اک تعمیر
وہی خانہ خراب ہیں ہم لوگ

کام ناکامیوں سے لیتے ہیں
کس قدر کامیاب ہیں ہم لوگ

کوئی ہم سا نہیں زمانے میں
آپ اپنے جواب ہیں ہم لوگ

گر دچہرے سے پونچھ کر دیکھو
غیرتِ ماہتاب ہیں ہم لوگ

ایک روشن سی جس کی ہے تعبیر　　وہی دُھندلا سا خواب ہیں ہم لوگ
جانتے ہیں کسی کی تابِ جفا　　پھر بھی جینے کی تاب ہیں ہم لوگ
زیست کا ماحصل ہے عہدِ شباب　　اور جانِ شباب ہیں ہم لوگ

کون دے گا صدا پہ اپنی صدا
نعرۂ انقلاب ہیں ہم لوگ

لوری

(سروجنی نائڈو کی ایک انگریزی نظم سے ماخوذ ہے)

نیلے آکاش سے (۱) اونچے کیلاش سے
لائی تیرے لیے میں نتاب
ہلکا ہلکا سا اک پیارا پیارا سا اک
ننھی آنکھوں کا مُنّا سا خواب

وہاں کے کھیت سے (۲) کھیت کی ریت سے
چُن کے لائی ہوں میں بے حساب
مسکراتے ہوئے جگمگاتے ہوئے
دھانی دھانی سنہرے سے خواب

باغ میں جھیل پر (۳) کچھ کنول ہیں جدھر
اور روش پر کھلے ہیں گلاب
میں اُسی کنج سے لائی تیرے لیے
بھینا بھینا نشیلا سا خواب

(۴)

کھیلتے ہیں جہاں ہولی ارض و سما
ڈوبتا ہے جہاں آفتاب
واں سے آئی ہوں میں ساتھ لائی ہوں میں
ایک رنگیں گلابی سا خواب

(۵)

نازنیں تتلیاں پی رہی ہیں جہاں
جامِ گل سے سنہری شراب
ان سے چھپ چھپ کے میں لائی چپکے سے میں
میٹھے میٹھے رسیلے سے خواب

(۶)

مُند گئیں انکھڑیاں رخصت اے میری جاں
بڑھ چلی ہے ستاروں میں تاب
سو یونہیں رات بھر دیکھ اب تا سحر
ایک معصوم بے لوث خواب

مسلم لیگ ۱۹۳۷ء

جہاں سے اپنی حقیقت چھپائے بیٹھے ہیں
یہ لیگ کا جو گھروندا بنائے بیٹھے ہیں

پڑے ہوئے ہیں نگاہوں پہ پردہ ہائے ریا
دلوں سے نقشِ صداقت مٹائے بیٹھے ہیں

زباں پہ دامنِ یوسف کی داستانیں ہیں
نظر کو خوابِ زلیخا بنائے بیٹھے ہیں

بھڑک رہی ہے تعصب کی دل میں چنگاری
چراغِ عقل و حقیقت بجھائے بیٹھے ہیں

ہر اک کے دین پہ الزامِ کافری رکھ کر
ہر ایک کفر پہ ایمان لائے بیٹھے ہیں

سجائے بیٹھے ہیں دوکاں وطن فروشی کی
ہر ایک چیز کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں

قفس میں عمر کٹے جی میں ہے غلاموں کے
چمن کی راہ میں کانٹے بچھائے بیٹھے ہیں

نہیں شریکِ مصیبت میں ہند کی لیکن
عراق و شام سے رشتے ملائے بیٹھے ہیں

گرائی ایک پسینہ کی بوند بھی نہ کبھی
متاعِ قوم میں حصہ بٹائے بیٹھے ہیں

ہر ایک گل کی طرف ہے درازدستی ہیں
ہر ایک خار سے چنگل بچائے بیٹھے ہیں

ہر ایک جلوہ کی جانب ہیں حرص کی نظریں
ہر ایک شعلہ سے دامن بچائے بیٹھے ہیں

خدا کی شان انہی سر کی رفعتوں پہ غرور
جو آستانِ عدو پر جھکائے بیٹھے ہیں

بھلا وہ قوم کو کیا دیں گے درسِ آزادی
جو آیتِ وطنیت بھلائے بیٹھے ہیں

وہ ہاتھ تیغِ سیاست کو کیا سنبھالیں گے
جو بزمِ عیش میں مہندی رچائے بیٹھے ہیں

سنیں گے خاک وہ بدبخت قوم کی آواز
جو ریڈیو سے شبستاں سجائے بیٹھے ہیں

نہ جوشِ حبِّ وطن ہے نہ جذبۂ ایثار
عمل کے نام سے آنکھیں چرائے بیٹھے ہیں

کوئی بتائے انہیں آزمائیں ہم کب تک
ہزار بار جنہیں آزمائے بیٹھے ہیں

جہاں میں سستِ عمل کا کہیں ٹھکانہ نہیں
کہ مفت خوروں کے پلنے کا اب زمانہ نہیں

سنہ ۱۹۳۸ء

غزلیات

(۱)

آ غم کہ اب تجھی پہ ہے دار و مدارِ دل　　تیرے سوا کسی پہ نہیں اختیارِ دل
آنکھیں نہیں تو کون ہے پھر راز دارِ دل　　کیوں کر تمہیں دلائے کوئی اعتبارِ دل
دل ہی رہے گا پھر نہ کوئی یادگارِ دل　　قائم رہے اگر یہی لیل و نہارِ دل
تنہائیٔ خزاں میں مجھے آ رہے ہیں یاد　　ایک ایک کر کے سارے رفیقِ بہارِ دل
بادل گھرے ہیں یاس کے اے چشمِ تر برس　　رہ جائے دل ہی دل میں نہ سارا غبارِ دل
ہر ہر نفس ہے تیز سا نشتر لیے ہوئے　　چبھنے لگا ہے زیست کے پہلو میں خارِ دل
کھوٹے کھرے کو دہر کے اس پر پرکھ کے دیکھ　　انساں کے جانچنے کیلئے ہے عیارِ دل
تنظیمِ کائنات میں ہوں میں ترا حریف　　تو کردگارِ حسن میں پروردگارِ دل
میرے لئے تو مٹ کے بھی ہے سرمۂ نظر　　خاکِ دیارِ دل تو ہے خاکِ دیارِ دل
پھر بھی کسی کے پردۂ رخ پر جمی ہے آنکھ　　جلوے تو سینکڑوں ہیں یمین و یسارِ دل

ملاؔ کے ضبطِ غم کی نہ پوچھو غریب نے
جاں دی مگر زباں پہ ڈالا نہ بارِ دل

(۲)

محشر میں ہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بکا سے پہلے
قافلہ غم کا چلا بانگِ درا سے پہلے

یہ تو سچ ہے کہ تجھے ترکِ جفا کا حق ہے
ہاں مگر پوچھ تو لے اہلِ وفا سے پہلے

اُڑ گیا جیسے یکایک مرے شانوں پر سے
وہ جو اک بوجھ تھا تسلیمِ خطا سے پہلے

ہاں یہی دل جو کسی کا ہے اب آئینۂ حسن
ایک پتھر تھا محبت کی جِلا سے پہلے

آنکھ جھپکا بھی تو دے دل کو چرانے والے
اک تبسم نگہِ ہوش رُبا سے پہلے

لذتِ زیست کوئی اس کے مقابل کی نہیں
وہ جو اک کیف سا طاری ہے خطا سے پہلے

ابتدا ہی سے نہ دے زیست مجھے درس اس کا
اور بھی باب تو ہیں بابِ رضا سے پہلے

درِ مے خانہ سے آتی ہے صلائے تازہ
آج سیراب کیے جائیں گے پیاسے پہلے

رازِ مے نوشیِ ملاؔ ہوا افشا ورنہ
کیا وہ بدمست نہ تھا لغزشِ پا سے پہلے

(۳)

کام عشق بے سوال آ ہی گیا
خود بخود اس کو خیال آ ہی گیا

تو نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر
دل کے آئینہ میں بال آ ہی گیا

دو مری گستاخ نظروں کو سزا
پھر وہ ناگفتہ سوال آ ہی گیا

زندگی سے لڑ نہ پایا جوشِ دل
رفتہ رفتہ اعتدال آ ہی گیا

حسن کی خلوت میں ڈرتا ہوا
عشق کی دیکھو مجال آ ہی گیا

غم بھی ہے اک پردۂ اظہارِ شوق
چھپ کے آنسو میں سوال آ ہی گیا

وہ اُفق پر آ گیا مہرِ شباب
زندگی کا ماہ و سال آ ہی گیا

بیخودی میں کہہ چلا تھا رازِ دل
وہ تو کہیئے کچھ خیال آ ہی گیا

ہم نہ کر پائے خطا بزدل ضمیر
لے کے تصویرِ مآل آ ہی گیا

ابتدائے عشق کو سمجھے تھے کھیل
مرنے جینے کا سوال آ ہی گیا

لاکھ چاہا ہم نہ لیں غم کا اثر
رُخ پہ اک رنگِ ملال آ ہی گیا

بچ کے جاؤ گے کہاں ملاّ کوئی
ہاتھ میں لے کر گلال آ ہی گیا

(۴)

یہ عشق کل تجھے حسنِ جواں ملے نہ ملے — نہ دیر کر کہ یہ جنس گراں ملے نہ ملے

بتوں سے مل کے بھی آرام جاں ملے نہ ملے — نظر ملے تو مزاجِ بتاں ملے نہ ملے

میں آج ہی اسے کیوں صرفِ دل نہ کر ڈالوں — یہ خوں کی بوند مجھے کل یہاں ملے نہ ملے

حدیثِ شوق ہمیں ترجماں تلاش کرے گی — زباں کی کون ضرورت زباں ملے نہ ملے

نگاہِ شوق نے دیکھا ہے اک حسین افق — مری جبیں کو ترا آستاں ملے نہ ملے

گلے لگا کے کیا نذرِ شعلۂ آتش — قفس سے چھوٹ کے پھر آشیاں ملے نہ ملے

متاعِ شوق کو اشکوں کے ساتھ بھیج بھی دو — پھر اس کے بعد کوئی کارواں ملے نہ ملے

چلو قبول بھی کر لو مرے سجودِ نیاز — اب ان کو اور کوئی آستاں ملے نہ ملے

حیاتِ فانیِ ملا کی لذتوں کی قسم
بلا سے زندگیِ جاوداں ملے نہ ملے

(۵)

مری بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے
تجھے دل تو کب کا میں دے چکا اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے

یہ تو ٹھیک ہے کہ تری جفا بھی ہے اک عطا مرے واسطے
مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے

مرا دل الگ ہے بجھا سا کچھ ترے حسن پر بھی چمک نہیں
کبھی ایک مرکزِ زیست پر انھیں ساتھ لا کے بھی دیکھ لے

مرے شوق کی ہیں وہی ضدیں ابھی لب پہ ہے وہی التجا
کبھی اُس جلے ہوئے طور پر مجھے پھر بلا کے بھی دیکھ لے

نہ مٹے گا نقشِ وفا کبھی نہ مٹے گا ہاں نہ مٹے گا یہ
کسی اور کی تو مجال کیا اسے خود مٹا کے بھی دیکھ لے

میں گلِ فسردۂ باغ ہوں مرے لب ہنسی کو بھلا چکے
تجھے اے صبا جو نہ ہو یقیں مجھے گدگدا کے بھی دیکھ لے

مرے دل میں تو ہی ہے جلوہ گر ترا آئینہ ہوں میں سر بسر
یونہی دور ہی سے نظر نہ کر کبھی پاس آ کے بھی دیکھ لے

مرے ظرفِ عشق پہ شک نہ کر مرے حرفِ شوق کو بھول جا
جو بھی حجاب ہے درمیاں، یہ حجاب اُٹھا کے بھی دیکھ لے

یہ جہان ہے اسے کیا پڑی ہے جو یہ سُنے تری داستاں
تجھے پھر بھی مُلّا اگر ہے ضد غمِ دل سُنا کے بھی دیکھ لے

---

(۶)

تری نگاہ مرے حسنِ رائگاں پہ نہیں — وگرنہ دل میں جو تارے ہیں آسماں پہ نہیں

مجھے یہ ڈر کہیں کچھ کہہ نہ دے نظر میری — انھیں گلہ کہ پیامِ نظر زباں پہ نہیں

کہیں یہی تو نہیں تیری برہمی کا سبب — مری نظر کا تقاضا مری زباں پہ نہیں

حیات فکرِ نشیمن میں کاٹنے والو — چمن کا کیا کوئی حق اہلِ آشیاں پہ نہیں

اِدھر بھی ایک نظر کیوں کسی پہ راز کھُلے — کہ ہر طرف تو پڑے تیر اور نشاں پہ نہیں

نئے ستم کی نہ دے دھمکیاں ہمیں اے چرخ — وہ کون برق ہے ٹوٹی جو آشیاں پہ نہیں

قبول اب بھی نہیں کیا مرے سجودِ نیاز — وہ کون خطِ جبیں ہے جو آستاں پہ نہیں

کسی کے پاؤں کا روندا ہوا نہیں ملّا
وہ ہے تو گرد مگر راہِ کارواں پہ نہیں

(۷)

میرے جگر کی تاب دیکھ، رُخ کی شکستگی نہ دیکھ
فطرتِ عاشقی سمجھ، قیمتِ عاشقی نہ دیکھ

اور نظر وسیع کر پیشِ نگاہ ہی نہ دیکھ
موت میں ڈھونڈ زندگی زیست میں نیستی نہ دیکھ

جیسے ہر اک نفس نفس نوکِ سناں لیئے ہوئے
عشق کا خواب دیکھ لے عشق کی زندگی نہ دیکھ

میں تو سرائے شوق میں دل کا کنول جلا چکا
اب یہ تری خوشی کہ تو دیکھ کہ روشنی نہ دیکھ

ایک اصول یاد رکھ سالکِ راہِ زندگی
نقش و نگارِ دہر دیکھ، مڑ کے مگر کبھی نہ دیکھ

اپنی نگاہ پھیر لے ہاں یہ مجھے قبول ہے
رکھ مری آرزو کی شرم، شوق کی بے بسی نہ دیکھ

تجھ پہ عیاں ہے رازِ دل جان کے بن نہ بے خبر
معنیِ خامشی سمجھ، صورتِ خامشی نہ دیکھ

ملّا یہ کیا لگا لیا دل کو ہنسی ہنسی میں روگ
بات بتا رہے تھے جو ہو کے رہی وہی نہ دیکھ

(۸)

جوشِ غم بھی دل کے کام آجائے ہے
چھپ کے آنسو میں پیام آجائے ہے

اپنے ہونٹوں سے لگا پاتا نہیں
میرے ہاتھوں تک تو جام آجائے ہے

اس سکوتِ غم کی تلخی کے نثار
یاد اک شیریں کلام آجائے ہے

جان کر لیتا نہیں میں تیرا نام
خود بخود ہونٹوں پہ نام آجائے ہے

ہجر کے ماروں کے جینے کا نہ پوچھ
صبح کٹتی ہے تو شام آجائے ہے

تجھ کو مجھ سے جب کوئی مطلب نہیں
کیوں تصوّر میں مدام آجائے ہے

دیکھ پایا وہ نہ مایوسی مری
گاہ ناکامی بھی کام آجائے ہے

گُل کھلا کر خوش نہ ہو نادان نسیم
یوں کہیں طرزِ خرام آجائے ہے

(۹)

زندگی گو کشتۂ آلام ہے — پھر بھی راحت کی امیدِ خام ہے
ہاں ابھی تیری محبت خام ہے — تیرے دل میں کاوشِ انجام ہے
عشق ہے، میں ہوں، دلِ ناکام ہے — اس کے آگے بس خدا کا نام ہے
آ، کہاں ہے تو فریبِ آرزو — آج ناکامی سے لینا کام ہے
میں وہی ہوں، دل وہی، ارماں وہی — ایک دھوکا گردشِ ایّام ہے
اپنے جی میں ہے کہ دنیا چھوڑ دیں — اور دنیا کو ہمیں سے کام ہے

جل چکے چشمِ اعزّا میں چراغ
سو بھی جا مُلّا کہ وقتِ شام ہے

(۱۰)

سنہرے خرمنوں کا رنگِ پنہاں دیکھ لیتا ہوں
ہر اک دانہ میں خونِ گرمِ دہقاں دیکھ لیتا ہوں

محبت کو جہاں دل کا نگہباں دیکھ لیتا ہوں
وہاں گنجائشِ تخمیرِ انساں دیکھ لیتا ہوں

جُڑی ہے خون سے مزدور کے ایک ایک اینٹ اسکی
لرز اُٹھتا ہوں میں جب کوئی ایواں دیکھ لیتا ہوں

کسی شوریدہ سر کی شکل پھر جاتی ہے آنکھوں میں
جہاں میں روزنِ دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

غمِ امروز میں بھی راحتِ فردا پہ نظریں ہیں
انھیں اشکوں کے قطروں میں چراغاں دیکھ لیتا ہوں

(۱۱)

اسے عقل والے نہیں جانتے ہیں ۔۔۔ وہ عاشقی کچھ نہیں جانتے ہیں

غمِ عشق کی تلخ صہبا کے عادی ۔۔۔ غمِ زیست کو انگبیں جانتے ہیں

بہت ہنس رہے ہیں یہ نادان غنچے ۔۔۔ ابھی باغباں کو نہیں جانتے ہیں

یہی بن کے خورشیدِ محشر اُٹھے گا ۔۔۔ جسے آج داغِ جبیں جانتے ہیں

تسلّی مرے قلب کو دینے والے ۔۔۔ زمانہ کو شاید نہیں جانتے ہیں

نظر میں تری آج کیا ہم نے دیکھا ۔۔۔ کہ اپنے کو بھی اب حسیں جانتے ہیں

مروّت کے ماروں کا ایماں نہ پوچھو ۔۔۔ نہیں منھ سے کرنا نہیں جانتے ہیں

ترے دل کی قیمت تری قدر ملّا

زمانہ نہ جانے حسیں جانتے ہیں

(۱۲)

دل کا چراغ جب تلک تجھ سے جلے جلائے جا
رات بھی ہے اگر تو کیا، رات کو دن بنائے جا

سانس سمائے جب تلک نغمۂ زیست گائے جا
ہونٹوں کو سی بھی دیں اگر دل ہی میں گنگنائے جا

حسن ہے بے وفا اگر عشق سے انتقام لے
لاکھ بھلائے وہ تجھے تو اُسے یاد آئے جا

وحشتِ حیات ڈال دے پاؤں میں آبلے تو کیا
تُو تو امید اک چمن پیشِ نظر کھلائے جا

تنگ نہ کر حدِ کرم، ظرفِ سوال دور پھینک
در پہ کسی کے بیٹھ اور یونہی صدا لگائے جا

جراتِ شوق سے نہ ڈر غفلتِ حسن تا بہ کے
خون کو دل بنائے جا، دل کو نظر بنائے جا

رازِ ترقیِ جہاں ایک یہی ہے مجھ سے سُن
شاہ کو ہوشیار کر، چور سے کہہ چرائے جا

مطربِ نغمۂ حیات بھول نہ دل کی تھاپ کو
ایک اصول یاد رکھ، سم پہ پلٹ کے آئے جا

رازِ نیاز ہے یہی مسلکِ عشق ہے یہی
دل میں سمجھ فریبِ حسن پھر بھی فریب کھائے جا

دو حقیقتیں

مرے ترقی پسند اک دوست کل یہ تقریر کر رہے تھے
ہر اک خرابیِ دورِ حاضر مجھی سے تعبیر کر رہے تھے
یہ کہہ رہے تھے "بِنا ہے تو ہی تمام باطل پرستیوں کی
ترے ہی دل میں ہیں خوابگاہیں مذاقِ انساں کی پستیوں کی
ترے ہی خوابوں کی چادروں سے نقوشِ ہستی چھپے ہوئے ہیں
ترے ہی جالے ہر ایک ایوانِ زندگی میں لگے ہوئے ہیں
وہی فسانے خلافِ فطرت ابھی ترے لب سنا رہے ہیں
وہی قدامت کے مقبروں میں ترے دیے ٹمٹما رہے ہیں"
جہاں میں دو ہی حقیقتیں ہیں، ہے جن پہ دار و مدارِ ہستی
ہے جن سے قائم نظامِ عالم، ہے جن کے دم سے بہارِ ہستی
ہے ایک ان میں سے جسم عورت کا دوسری جیب مرد کی ہے
جہاں کی ہر شاہراہِ اخلاق انھیں کے قدموں نے گرد کی ہے

ہر اک تمدّن کا خوں کیا ہے، ہر ایک تہذیب خاک کی ہے
ہمیشہ دستِ ہوس سے اپنے نقابِ فطرت کی چاک کی ہے
ہر ایک گنبد میں زندگانی کے گونجتی ہیں صدائیں ان کی
گڑی ہیں ہر انقلابِ دنیا کے زلزلوں میں بنائیں ان کی
جہاں میں تیرے سے چند ناداں جو نام الفت کا لے رہے ہیں
وہ یا تو خود کھا رہے ہیں دھوکا نہیں تو دھوکا سا دے رہے ہیں
کہاں گزر ان لطافتوں کا حیات کی سخت منزلوں میں
انھیں تو بھول آئی کب کی دنیا ترے تصوّر کی محفلوں میں
مثالِ حرفِ غلط انھیں لوحِ زندگی سے مٹائیں گی یہ
ہوائے دنیا کے رُخ پہ رکھ کر چراغ تیرے بجھائیں گی یہ
حیات کو اک نہ ایک دن یہ برہنگی کا پیام دیں گی
ترے جنازے کو دوش پر لے کے دعوتِ رقصِ عام دیں گی"

(۲)

اگر یہی دو حقیقتیں ہیں تو میں یقیناً ہوں نقشِ باطل
اگر محبت ہے زہر ہستی تو شعر میرے ہیں سمِّ قاتل

مگر یہ کیا بات ہے کہ جب ایک دوسرے سے یہ چار ہوں گی
ہنسی اُڑاتی تھیں جس پہ میری اُسی طرح بے قرار ہوں گی
بڑھیں گی اک دوسرے کی جانب مرا پیام نگاہ لے کر
مرے ہی سینے سے آگ لیکر مرے ہی ہونٹوں سے آہ لے کر
سنائیں گی یہ بصد ترنم کبھی نظر سے کبھی زباں سے
وہی ترانے اُڑا لیے ہیں جو میرے پہلائے خوں چکاں سے
مرے تصور سے رنگ لیں گی مرے ہی خوابوں سے نور لیں گی
مری تمناؤں کے خزانوں سے اپنے موتی ضرور لیں گی
الٰہی کس ارتقا کے مرکز کی سمت تہذیب جا رہی ہے
کہ جیسے انسانیت سے اپنی بشر کو خود شرم آ رہی ہے
یہ عقل کی مادہ پرستی، مزاجِ دنیا بدل رہی ہے
یہ روحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے
مجھے یہ تسلیم میں بشر ہوں جگر میں پانی نہیں لہو ہے
ہزار ہیں دل میں آرزوئیں مگر یہی جانِ آرزو ہے

مری امیدیں مری امنگوں کے چاہے کام آئیں یا نہ آئیں
مرے ستارے بغیر چمکے ہی چاہے سینہ میں ڈوب جائیں
مگر میں اس بد مذاق دنیا سے ایک دن انتقام لے لوں
میں اپنے خونِ جگر کے قطروں سے کاش اتنا ہی کام لے لوں
بڑے جو بنتے ہیں عقل والے انھیں بھی دل کا پیام دیدوں
سحر کے بے روح پیکروں کو حرارتِ خونِ شام دیدوں
جمے ہوئے ہیں جو برف میں دل انھیں بھی اک شعلہ زار کر دوں
جہاں کی سیلی ہوئی فضاؤں کو برق سے ہمکنار کر دوں

سنہ ۱۹۳۹ء

غزلیات

(۱)

غیر کے در پہ بھی اشک بداماں ہونا
یہی معراجِ بشر ہے یہی انساں ہونا

اشکِ غم دیکھ اس اعزاز کے شایاں ہونا
ہے تجھے شمعِ شبِ تارِ غریباں ہونا

دل تو صد چاک مگر لب پہ تبسم ہے وہی
گل سے سیکھو چمنِ دہر میں خنداں ہونا

خلشِ عشق ہی بن جائے گی سرمایۂ زیست
اسی نشتر کو ہے اک روز رگِ جاں ہونا

اُف ری ناکامیِ پیہم کہ کبھی بہرِ دعا
ہاتھ اُٹھانا تو اٹھاتے ہی پشیماں ہونا

بس تو یہ بھی نہیں اک پھول قفس میں رکھ لیں
اور نگاہوں میں گلستاں کا گلستاں ہونا

قسمتِ صولت شاہی میں لکھا تھا اک دن
چینِ پیشانیِ دہقاں سے نمایاں ہونا

ہائے وہ عشق کے آغاز کا اندازِ لطیف
دل کا خود اپنی تمنا پہ پشیماں ہونا

کچھ بھی کہنے کی مجھے اُن سے ضرورت نہ پڑی
آگیا کام مرا بے سروساماں ہونا

کتنے پودوں کی ملی خاک میں رعنائیِ قد
تب کسی سرو نے سیکھا ہے خراماں ہونا

وہ اگر خوش بھی ہو عرفانِ خوشی اُس کو نہیں — جس نے جانا نہ کسی غم میں پریشاں ہونا

اِس کو مژگاں میں چھپائے کہ ہے غم کی توہین — عِصمتِ اشک کا آلودۂ داماں ہونا

آمدِ موسمِ حرماں کا وہ اندازِ حسیں — شاخِ مژگاں کا سمن پوش و گل افشاں ہونا

اِس کو خودداریِ ملّا نے گوارا نہ کیا
آتشِ غیب کے شعلوں سے فروزاں ہونا

فروری ۱۹۳۹ء

(۲)

آئینۂ رنگینِ جگر کچھ بھی نہیں کیا
کیا حسن ہی سب کچھ ہے نظر کچھ بھی نہیں کیا

چشمِ غلط انداز کے شایاں بھی نہ ٹھہرے
جذبِ غمِ پنہاں میں اثر کچھ بھی نہیں کیا

نظریں ہیں کسی کی کہ ہے اک آتشِ سیّال
یوں آگ لگانے میں خطر کچھ بھی نہیں کیا

ادنیٰ سا اشارہ بھی ہے جس کا مجھے اک حکم
اُس پر مری آہوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا

مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر
لیکن مرے جلنے میں ضرر کچھ بھی نہیں کیا

یوں بھی کوئی دنیا کی نگاہوں سے نہ گر جائے
مُلّا کو بُرا کہنے میں ڈر کچھ بھی نہیں کیا

فروری ۱۹۳۹ء

(۳)

مری باتوں پہ دنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے
مری دیوانگی شاید مسلّم ہوتی جاتی ہے

توجّہ کی نظر میری طرف کم ہوتی جاتی ہے
میں خوش ہوں عشق کی بنیاد محکم ہوتی جاتی ہے

ضرورت کچھ بھی کہنے کی بہت کم ہوتی جاتی ہے
مری صورت ہی اب شوقِ مجسّم ہوتی جاتی ہے

کبھی تو نے پکارا تھا مجھے کچھ شک سا ہوتا ہے
مرے کانوں میں اک آوازِ مبہم ہوتی جاتی ہے

مجھے سمجھانے آئے ہیں کہ میں رونے سے باز آؤں
مرے سمجھانے والوں کی نظر نم ہوتی جاتی ہے

ابھی سُن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو
کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے

وہی دل ہے مگر اب وہ نہیں اگلی سی بیتابی
وہی خوں ہے مگر رفتار مدّھم ہوتی جاتی ہے

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

نشاطِ زیست کی ضامن ہو اب یادِ محبت ہی
یہی خود عشق کے زخموں کا مرہم ہوتی جاتی ہے

محبّت ہی سے کھولو تم دلِ ملّا کا دروازہ
یہی اس کے لئے اب اسمِ اعظم ہوتی جاتی ہے

مارچ ۱۹۳۹ء

(۴)

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی | سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی

جائیں گی دل کو چھوڑ کے ناکامیاں کبھی | نکلے گی اس چمن سے بھی آخر خزاں کبھی

بھولے سے بھی ملے گا نہ آرامِ جاں کبھی | دنیا کو جان کر بھی نہ تھا یہ گماں کبھی

اتنا تو یاد سا ہے کہ ہم تھے جواں کبھی | پھرتی ہیں کچھ نگاہ میں پرچھائیاں کبھی

دو گل قفس میں رکھ کے نہ صیاد دے فریب | دیکھا ہی جیسے ہم نے نہیں آشیاں کبھی

وہ آرزو ہی دشمنِ جاں بن گئی جسے | دی تھی غمِ حیات سے دل میں اماں کبھی

بھولے ہوئے ہو تم تو دلائیں گے ہم نہ یاد | ہم تم بھی راہِ زیست میں تھے ہم عناں کبھی

ویرانیٔ نگاہ پہ میری نہ جائیے | پلتی تھیں اِن کے سائے میں بھی بجلیاں کبھی

ہاں ہاں یہی جو چشم تک آئی ہیں بن کے اشک | نام ان کا تھا امید کی رنگینیاں کبھی

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار | گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف | پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

مُلّا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اُردو زباں کبھی

اپریل ۱۹۳۹ء

(۵)

خود اپنے دل کی روش پر نہ کیوں ہراس آئے
چلے گا چال وہی جو عدو کو راس آئے

پھر آیا ہوش مجھے تم جو میرے پاس آئے
تم آئے یا مرے کھوئے ہوئے حواس آئے

نہیں ہیں طالبِ کوثر مجھے تو دے ساقی
وہ مے کہ جس میں لبوں کی ترے مٹھاس آئے

مٹا کے تفرقۂ دل ملے نہ دیر و حرم
ہزار بار دکھانے کو پاس پاس آئے

تری جفا کو جفا میں تو کہہ نہیں سکتا
ستم ستم ہی نہیں ہے جو دل کو راس آئے

وہ لب نصیب نہیں ہیں تو کم سے کم ساقی
کسی کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا گلاس آئے

حجاب دیر و حرم میں اگر چھپا نہ اُسے
نظر کے سامنے وہ جلوہ بے لباس آئے

جفائے دوست کو ملّا سمجھ رہے ہیں کرم
بڑے وہاں سے کسی کے ادا شناس آئے

اپریل ۱۹۳۹ء

(۶)

جب دل میں ذرا بھی آس نہ ہو اظہارِ تمنا کون کرے
ارمان کیے دل ہی میں فنا، ارمان کو رسوا کون کرے

خالی ہے مرا ساغر تو رہے ساقی کو اشارا کون کرے
خود داریِ سائل بھی تو ہے کچھ ہر بار تقاضا کون کرے

جب اپنا دل خود لے ڈوبے، اوروں پہ سہارا کون کرے
کشتی پہ بھروسا جب نہ رہا تنکوں پہ بھروسا کون کرے

آدابِ محبت بھی ہیں عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں
لیکن یہ تکلف حائل ہے پہلا وہ اشارا کون کرے

دل تیری جفا سے ٹوٹ چکا، اب چشمِ کرم آئی بھی تو کیا
پھر لے کے اسی ٹوٹے دل کو امید دوبارا کون کرے

جب دل تھا شگفتہ گل کی طرح ٹہنی کانٹا سی چبھتی تھی
اب ایک فسردہ دل لیکر گلشن کی تمنا کون کرے

بسنے دو نشیمن کو اپنے پھر ہم بھی کریں گے سیرِ چمن
جب تک کہ نشیمن اجڑا ہے پھولوں کا نظارا کون کرے

اک درد ہے اپنے دل میں بھی، ہم چپ ہیں دُنیا ناواقف
اوروں کی طرح دہرا دہرا کر اس کو فسانا کون کرے

کشتی موجوں میں ڈالی ہے مرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں
اب طوفانوں سے گھبرا کر ساحل کا ارادا کون کرے

ملّا کا گلا تک بیٹھ گیا، بہری دنیا نے کچھ نہ سُنا
جب سننے والا بہرا ہو رہ رہ کے پکارا کون کرے

جون ۱۹۳۹ء

(۷)

نہیں ہیں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر
گر نگاہِ ترحم سے شرمسار نہ کر

یہ رازِ دوست ہے الفت کو آشکار نہ کر
جو ہو سکے تو نظر تک کو رازدار نہ کر

نہ شاخ ہی پہ کہیں سوکھ جائیں پھول مرے
جو توڑنا ہوں تو اب توڑ انتظار نہ کر

بدل نگاہِ غضب کو نہ تو تغافل سے
تعلقات گوارا کو ناگوار نہ کر

اب اس قدر بھی نہ دنیا کو کم نگاہ سمجھ
غموں کو خندۂ باطل سے آشکار نہ کر

دیارِ حسن کی رنگینیاں قبول مگر
نگاہِ شوق کا جلدی سے اعتبار نہ کر

کٹا ہے ناصحِ مشفق سے گفتگو میں جو وقت
اُسے تو زیست کی میعاد میں شمار نہ کر

مآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب
خزاں کے خوف سے رسوائیِ بہار نہ کر

خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہی کیا ہے
مری بہار سے اندازۂ بہار نہ کر

جفائے دوست پہ شکوے نہ چھیڑ اے ملاؔ
عدو کے رنگ کو بھولے سے اختیار نہ کر

جون ۱۹۳۹ء

(۸)

ہر اک دل نہیں بہرہ یابِ محبت
سکوں کھو کے ملتی ہے تابِ محبت

سنبھل کر ذرا تیز گامِ تمنا
کہیں دے نہ دھوکا سرابِ محبت

رُخِ حسن کا سب بھرم کھل نہ جائے
نہ دیکھو اُٹھا کر نقابِ محبت

بدل جائیں گے خود نگاہوں کے تیور
تغافل سے کب تک جوابِ محبت

یہ کس نے نظر کی کہ ہر ذرّۂ دل
تڑپ کر بنا آفتابِ محبت

ہنسو یوں نہ آغازِ اُلفت پہ پیکر
کہیں لے نہ بدلہ شبابِ محبت

عجب حالتِ دل ہے غم میں کسی کے
نہ تابِ جُدائی نہ تابِ محبت

محبت کبھی کر کے دیکھو تو مُلّاؔ
یونہی کب تلک مستِ خوابِ محبت

اگست ۱۹۳۹ء

(۹)

یہی ہیں ترا نام کرجانے والے
ترے غم میں جی جی کے مرجانے والے

کہیں دے نہ دھوکا سرابِ تمنا
ذرا ہوش میں بے خبر جانے والے

گزرگاہِ ہستی سے لیتا ہوا جا
ہر اک شے کا دل پر اثر جانے والے

یہی موجِ ساحل ہے طوفانِ دل کی
یہ قطرے جو ہیں تا نظر جانے والے

محبت کی بازی خرد خاک سمجھے
اسے جیت جاتے ہیں ہر جانے والے

اندھیرے مکان کے لئے روشنی دی
ان آنکھوں کو اشکوں سے بھر جانے والے

ذرا غور سے دیکھ پھر دیئے ہستی
فقط ظاہری حسن پر جانے والے

یہ ملّا کو بیٹھے بٹھائے ہوا کیا ...
ابھی دن نہ تھے اس کے مرجانے والے

اکتوبر ۱۹۳۹ء

(۱۰)

اُسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی
بغیر یاد کیے کٹ سکی نہ رات کبھی

سمجھ میں آئی ہمیں عشق کی نہ بات کبھی
یہی حیات یہی دشمنِ حیات کبھی

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں رُکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

ہمیں پہ انجمنِ دوست کا مدارِ سخن
وہ ہم جو کہہ نہ سکے اپنے دل کی بات کبھی

وہ آب و تاب شبِ غم تھی اشکِ رنگیں کی
اس اہتمام سے نکلی نہ تھی برات کبھی

اک انتقامِ محبت نظر میں ہے ملّاؔ
وہ لگ گئے جو مری آرزو کے ہات کبھی

نومبر ۱۹۳۹ء

(۱۱)

جھجک اظہارِ ارماں کی بآسانی نہیں جاتی
خود اپنے شوق کی دل سے پشیمانی نہیں جاتی

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

افق پر نور رہ جاتا ہے سورج ڈوبنے پر بھی
کہ دل بجھ کر بھی نظروں کی درخشانی نہیں جاتی

سوئے دل آکے اب چشمِ کرم بھی کیا بنا لیگی
شعاعِ مہر سے صحرا کی ویرانی نہیں جاتی

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

کسی کی لطفِ بے پایاں نے کچھ یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

تغافل پر نہ جا اس کے، تغافل ایک دھوکا ہے
نگاہِ دوست کی تحریکِ پنہانی نہیں جاتی

نظر جھوٹی، شباب اندھا، وہ حسن اک نقشِ فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی

میسر ہے ہر اک ایماں میں مجھ کو ذوق کا سجدہ
کوئی مذہب بھی ہو بنیادِ انسانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

نہ سمجھو ضبطِ گریہ سے خطا پر میں نہیں نادم
کہ آنسو پونچھ لینے سے پشیمانی نہیں جاتی

نہ پوچھو تجرباتِ زندگانی چوٹ لگتی ہے
نظر اب دوست اور دشمن کی پہچانی نہیں جاتی

زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لیتا ہے اور ملاؔ
تری اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

دسمبر ۱۹۳۹

(۱۲)

اُفقِ دہر پہ اک مہرِ درخشاں نکلا
میں نے دیکھا تو چراغِ تہِ داماں نکلا

نہ چھپا پر نہ چھپا خونِ شہیدانِ وفا
غنچہ غنچہ میں عیاں رازِ گلستاں نکلا

تیری اُجڑی ہوئی جنّت کو بسانے والا
وہی غصہ میں نکالا ہوا انساں نکلا

تختۂ مشقِ نگاہِ غلط انداز سہی
شکر ہے دل کسی خدمت کے تو شایاں نکلا

آج پھر تازہ ہوئی بزم میں یادِ ملّاؔ
کیا ترے در سے کوئی بے سر و ساماں نکلا

نوروز

آج پھر گلشنِ ہستی میں بہار آئی ہے — پھر ہر اک غنچہ و گل محوِ خود آرائی ہے
پتّی پتّی سے عیاں جلوۂ زیبائی ہے — ہر شجر منظرِ کیفیتِ رعنائی ہے

جس طرف بادِ صبا آج نکل جاتی ہے
نئی کلیوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے

آج آتا ہے نئے سر سے شبابِ دنیا — اک نیا جام بدلتی ہے شرابِ دنیا
کچھ ذرا اور سرکتی ہے نقابِ دنیا — اک ورق اور پلٹتی ہے کتابِ دنیا

ختم پر حسرتِ ماضی کا فسانہ آیا
پھر زمانے کے بدلنے کا زمانہ آیا

پھر تمنّا کی نظر میں کوئی تصویر سی ہے — پھر ارادوں میں ذرا ہمت تعمیر سی ہے
دلِ پُر شوق میں پھر جرأتِ تقصیر سی ہے — آج کچھ چیز ہوا میں ہے جو اکسیر سی ہے

رُوئے ارماں پہ ہے رنگینیِ غازہ پھر سے
آج جی میں ہے کوئی عہد ہو تازہ پھر سے

زیست بے کیف ہے کچھ غیرِ سکوں جس میں نہیں — اشک بے رنگ ہے آمیزشِ خوں جس میں نہیں

درد وہ درد نہیں سوزِ دروں جس میں نہیں عشق وہ خام ہے اندازِ جنوں جس میں نہیں
خون ہے جوشِ تمنا میں اُبلنے کے لئے
زیست ہے موت کی آغوش میں پلنے کے لئے

پھول کب تک کھلیں پیغامِ بہاراں لے کر دستِ گلچیں کے لئے دولتِ داماں لے کر
عشرتِ خانۂ صیاد کا ساماں لے کر اس سے بہتر ہے کہ مٹ جائیں گلستاں لے کر
شاہد اس جذبۂ غیرت کا زمانہ تو رہے
ہم رہیں یا نہ رہیں اپنا فسانہ تو رہے

طنز سے محفلِ اغیار میں چرچا تو نہ ہو جس سے ماضی کو حیا آئے وہ فردا تو نہ ہو
ہم مٹیں ہم پہ مگر خندۂ اعدا تو نہ ہو خونِ ہستی ہو مگر خونِ تمنا تو نہ ہو
یہی پیغامِ جنون آج صبا لائی ہے
وہی زندہ ہے کسی دھن میں جو سودائی ہے

تپشِ درد کو پھر تابِ دل افروزی دیں ناوکِ شوق کو پھر اذنِ جگر دوزی دیں
پھر کسی برق کو پیغامِ نظر سوزی دیں آج پھر زیست کو اک مژدۂ نوروزی دیں
پھر مے رنگ لیے دوشیزۂ سال آئی ہے
آج تقصیر کوئی ہے تو شکیبائی ہے

جہاں میں ہوں

وہی حرص وہوس کا تنگ زنداں ہے جہاں میں ہوں
وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں

تمنا قید، ہمت پا بجولاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیرِ امکاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید سُرخ ہو جائے
ابھی پانی کا ایسا خونِ دہقاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید فرشتہ آدم خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں

کسی قیمت پہ بھی انسانیت ڈھونڈے نہیں ملتی
مگر جنسِ خدائی اب بھی ارزاں ہے جہاں میں ہوں

ہوائے علم شمعیں رُوح کی گُل کرتی جاتی ہے
خرد کے ہاتھ میں دل کا گریباں ہے جہاں میں ہوں

افق پر ہوں تو ہوں دُھندلے سے کچھ جلوے مسرت کے
ابھی راحت فقط اک خوابِ ارماں ہے جہاں میں ہوں

غرض مندی کی پوجا عام ہے یوں ہر شوالے میں
محبت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن کوئی چنگاری نہ دنیا کو جلا ڈالے
جہاں خود اپنے شعلوں سے ہراساں ہے جہاں میں ہوں

غلاموں کی ہنسی ہی کیا بس اک آوازِ بے نغمہ
بہارِ باغ ہم رنگ بیاباں ہے جہاں میں ہوں

نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں

فقط ہلکی سی سطحِ آب پر ہے ایک جنبش سی
زبانوں پر فقط اک ذکرِ طوفاں ہے جہاں میں ہوں
خدا وہ دن تو لائے سوز بھی اک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اک سوزِ پنہاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوقِ آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں
بدلنے کو بدل جائے جہاں لیکن ابھی ملاّ
وہی دنیائے برق و بادِ وباراں ہے جہاں میں ہوں

جون ۱۹۳۵ء

میری دُنیا

(۱)

بزمِ جہاں میں تیرے قابل نہ بن سکوں گا
افسردہ دل ہوں زیبِ محفل نہ بن سکوں گا

اک عارضی نمائش روحِ نظام تیری
رنگینیِ تصنّع جانِ کلام تیری

تیرے چراغِ محفل دل ہیں جلے ہوؤں کے
نغموں کا زیر و بم ہے تاروں پہ آنسوؤں کے

چہروں پہ جن کے جھوٹی سرخی سی ہے خوشی کی
چوٹیں ہیں ان کے دل میں ضرباتِ زندگی کی

دھوکا نہ کھاؤں گا میں ظاہر کے چہچہوں سے
نالے چھپا رہی ہے تو اپنے قہقہوں سے

جو تشنگی بجھائے تجھ میں وہ شے نہیں ہے
ساغر تو خوش نما ہے ساغر میں مے نہیں ہے

دل کے بجائے تیرے سینہ میں اب ہے پتھر
بے رُوح ہو چکا ہے تیرا حسین پیکر

میری نظر میں تو ہے اک مصریوں کا مردہ
ظاہر ترا شگفتہ باطن ترا فسردہ

شعلوں میں تیرے پیکر انساں پگھل گئے ہیں
بازارِ زندگی کے سکے بدل گئے ہیں

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں تیرے صنم کدوں میں

دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے

لاشوں پہ ہے بنائے ایوانِ کامیابی
چونے کی جا لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی

سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں — مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں
چٹکی میں مل گیا جو اس کو مسل ہی ڈالا — زیرِ قدم جو آیا کچ سے کچل ہی ڈالا
انساں اتر رہا ہے رسمِ درندگی پر — تہذیب آ گئی ہے حدِ برہنگی پر

کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

۲

اک بار دورِ گردوں ایسا نظام بھی ہو — جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو
مظلوم کا کلیجہ تیرِ ستم نہ ڈھونڈے — ایوانِ شادمانی بنیادِ غم نہ ڈھونڈے
اک آرزوئے باطل فکرِ سکوں نہ ٹھہرے — الفت فقط مذاقِ اہلِ جنوں نہ ٹھہرے
تصویرِ نامرادی نقشِ جبیں نہ نکلے — راحت دلِ حزیں کا خوابِ حسیں نہ نکلے
کھوئے تکلفوں میں الجھی نہ گفتگو ہو — دل کی کھری زباں میں اظہارِ آرزو ہو
انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو — پیشانیِ بشر کا تیور پلٹ چکا ہو
برفِ خرد میں جل کر دل سُن نہ ہو گئے ہوں — آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے نہ جم چکے ہوں
غیروں کے درد پر بھی دل میں ذرا کسک ہو — خونِ سفید میں کچھ سرخی کی بھی جھلک ہو
انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ جس ہوا میں — دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں

ایسی زمیں بھی کوئی کیا زیرِ آسماں ہے
میرے خیال بتلا دنیا مری کہاں ہے

زمینِ وطن

زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات
لیئے اپنی آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمعِ ذات و صفات

حجابِ عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں بسترِ برف سے مستِ خواب
اٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب

جہاں آئی پہلی سنہری کرن
زمین وطن! اے زمین وطن!!

جہاں پہلے تخلیقِ انساں ہوئی
تری رحمت اس کی نگہباں ہوئی
خرد اس کی گہوارہ جنباں ہوئی
بشر نے تمدن کے سیکھے چلن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں ابنِ آدم پلا گود دیوں
جہاں نسلِ انساں چلی گھٹنوں
جہاں چشمِ حیرت کے کیا اور کیوں
لبِ طفل تک آئے بن کر سخن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں خیر و شر میں ہوا امتیاز
بنی زیست مجموعۂ سوز و ساز
کھلا رازِ ایماں سے ہستی کا راز
تراشے گئے ایزد و اہرمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

وہ انساں کا بڑھتا ہوا اعتقاد
بنے دیوتا آتش و آب و باد
پرستش پہ دارو مدارِ مراد
وہ ویدوں کے میٹھے سُریلے بھجن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں اک کنول پر بہ صد دلبری
اُٹھی دودھ کے کنڈ سے لکشمی
قدم شِو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی
اُتر آئی گنگا جہاں خندہ زن!
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں تیرے جلوے ہویدا ہوئے
جہاں اہلِ دل ان پہ شیدا ہوئے
جہاں گوتم اور کرشن پیدا ہوئے
جہاں سازِ فطرت ہوا نغمہ زن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

گئے چھوڑ کر اپنے اپنے نشاں
ہوئے باری باری جہاں کامراں
جہاں آکے اُترا ہر اک کارواں
مغل، آریہ، ترک تاتار ہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

لیے غیر ملکوں نے تجھ سے سبق
تری داستاں کے اُڑائے ورق
ترے خوشہ چیں از شفق تا شفق
عرب، مصر، یونان، چین و ختن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

شبستانِ ایراں کا سامان و ساز
ترقّیِ بازارِ وینس کا راز
وہ خود اہلِ روما کو تھا جن پہ ناز
ترے دستکار اور ترے اہلِ فن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن؟
ترے اہلِ دانش ترے اہل فن؟
کہاں ہے ترا اقتدارِ کہن؟
ترے رام لچھمن، بھرت شترگن
زمینِ وطن! اے زمین وطن!!

کسے آئے گا آج اس کا یقین
اشوک اور اکبر کی اے سرزمین
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں
کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمینِ وطن! اے زمین وطن!!

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دُلہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

نہیں کوئی تیرے لئے پرخروش
تری راہ میں عازم وسخت کوش
نہ نادر کا جذبہ نہ غزنی کا جوش
نہ وہ بندۂ زر نہ وہ بت شکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

کوئی اب تری سمت آتا نہیں
نظر تیری جانب اٹھاتا نہیں
تجھے کوئی اپنا بناتا نہیں
کہ جیسے کوئی لاش ہو بے کفن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

مٹا کر تری گرم بازاریاں
بنیں اہلِ یورپ کی زرداریاں
ترے خوں کی سینچی ہوئی کیاریاں
یہ مغرب کے سب لہلہاتے چمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

نہیں کون آلودۂ خون و خاک
ہوا ہو نہ جو اس فضا میں ہلاک
جسے کہہ سکیں ہم غلامی سے پاک
نہ سنگِ ہمالہ نہ آبِ جمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

ترے دورِ ماضی کے آئینہ دار
تری شانِ اسلاف کی یادگار
کہیں کچھ کھنڈر ہیں کہیں کچھ مزار
نہ وہ اہلِ محفل نہ وہ انجمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن!!

یہ دہلی کے نقش و نگار خموش
یہ چیتوڑ کی خاک لالہ فروش
یہ کیلاش کی چوٹیاں برف پوش
تجھے ڈھونڈتی ہیں عروجِ کہن
زمینِ وطن! اے زمین وطن!!

یہ معصوم بچّے ترے شیر خوار
امیدیں لیے شوق سے ہم کنار
گلے ان کے ہوں اور غلامی کے ہار
اور آئے نہ تیری جبیں پر شکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ دوشیزگانِ وطن سبز فام
رہیں یوں کنیزیں جنیں یوں غلام
تری تیغِ غیرت نہ ہو بے نیام
ہوا ہے سفید آہ خونِ وطن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

تجھے صولتِ بابری کی قسم
تجھے عصمتِ پدمنی کی قسم
تجھے خاک پانی پتی کی قسم
پھر اک بار دکھلا جلالِ کہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

بدلنے کو ہے موسمِ روزگار
ہواؤں میں ہے ایک کیفِ خمار
تری سمت پھر آ رہی ہے بہار
لیے پھر گل و لالہ و نسترن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

پھر آنے کو ہیں سوئے گلشن اسیر
برسنے کو ہے پھر گھٹاؤں سے نیر
چٹانوں میں ہے مضطرب جوئے شیر
کہاں ہے کہاں تیشۂ کوہکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساواتِ انساں کا پھر نام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

سنہ ۱۹۳۰ء

غزلیات

(۱)

ہجر کی شب گھڑی گھڑی دل سے یہی سوال ہے
جس کے خیال میں ہوں گم اُس کو بھی کچھ خیال ہے
ہائے ری بے بسیِ شوق دل کا عجیب حال ہے
اُس کا جواب سُن چکا پھر بھی وہی سوال ہے
خواب و فسوں نہیں تو کیا، دل یہ جنوں نہیں تو کیا
خلوتِ دوست اور تو تیرا کہاں خیال ہے
میں ترے در کو چھوڑ دوں، شرطِ وفا کو توڑ دوں
سوچ خود اپنے دل میں تو کیا یہ مری مجال ہے
شرم سی نذر دل کی ہے اُٹھتی نہیں نگاہِ شوق
عشق کی منزلوں میں اک منزلِ انفعال ہے

چاہیں گے گر تو دل کی بات، آپ ہی جان لیں گے وہ
منھ سے کہوں تو کیا کہوں تشکل مری سوال ہے

بات انھیں کی مان لی جیسے میں ہی خطا پہ تھا
ان کو کہیں یہ شک نہ ہو دل میں مرے ملال ہے

اب تری جستجو، ہوئی ہمتِ دل کے حسبِ ذوق
تو نے یہ جب سے کہدیا یہ طلبِ محال ہے

سطحِ مذاقِ بزم پر ملّا اُتر کے آ نہ تو
اوروں کا جو کمال ہے تیرے لئے زوال ہے

جنوری ۱۹۴۰ء

(۲)

دیکھا کچھ آج یوں کسی غفلت شعار نے
میں اپنی عمرِ رفتہ کو دوڑا پکارنے

ہنگامۂ شباب کی پوچھو نہ سرگزشت
اپنے چمن کو لوٹ لیا خود بہار نے

پیکانِ تیر زہر میں اتنے بجھے نہ تھے
کچھ اور کر دیا ہے نظر کو خمار نے

تمت بخیر دل کی شکایت کی داستاں
ہونٹوں کو سی دیا نگہِ شرمسار نے

ہمت پڑی نہ شیخ سے کہنے کی محتسب
آئے ہو اک غریب پہ غصہ اتارنے

وہ تو کہو کہ آئی قفس تک بھی بوئے گل
ورنہ بھلا دیا تھا ہمیں تو بہار نے

جو ننگِ گل تھے طرۂ دستار بن گئے
جو گل تھے آئے تربتِ بیکس سنوارنے

آئے ہو کیا تمہیں مجھے آواز دو ذرا
آنکھوں کا نور چھین لیا انتظار نے

آلامِ روزگار سے ملّا کو کیا غرض
اپنا بنا لیا ہے اسے چشمِ یار نے

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

(۳)

تجھی کو آنکھ اُٹھانے کی اُسے مُلّا نہ تاب آئی
حقیقت ورنہ آئی سامنے اور بے نقاب آئی

شبِ غم بھی مہک اُٹھی خیالِ دوست کے صدقے
ہر اک آنسو کے قطرہ میں مجھے بوئے گلاب آئی

بھلا میری یہ ہمت تھی کہ تم سے عرضِ دل کرتا
جبینِ بے شکن دیکھی تو کچھ کہنے کی تاب آئی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں ترسی ہوئی نظریں
تمہیں ہو سامنے یا پھر وہی تصویرِ خواب آئی

تری چشمِ کرم کے سوئے دل آنے کو کیا کہیے
کہ جیسے کُنجِ زنداں میں شعاعِ ماہتاب آئی

تجھے یہ حق تو حاصل ہے بدل دے رسم در اپنی
ابھی تک تو کفِ سائل ہمیشہ کامیاب آئی

جسے میں چاہتا ہوں وہ اگر قسمت سے بالا ہے
مرے حصّے میں کیوں میری نگاہِ انتخاب آئی

کرن مہتاب کی پھولوں میں جب نھی جان بن کے تھی
یہی ذرّوں میں کیا آئی کہ موجِ اضطراب آئی

قفس کی تیلیاں بن جائیں شاخِ گل تو ہم جانیں
چمن میں شور ہے ہر سو ہوائے انقلاب آئی

خرد جھوٹی حقیقت سے لگی جب مجھ کو بہکانے
مرے دل کے پیمبر پر محبت کی کتاب آئی

شبِ غم بھی مجھے پیاسا نہ چھوڑا میرے ساقی نے
مری آنکھوں سے چھن کر میرے حصہ کی شراب آئی

سُوارت ہو گئی مُلّا کی عمرِ رائگاں آخر
انھیں آج اس کی یاد آئی اُسے یادِ شباب آئی

جنوری ۱۹۴۰ء

(۴)

امیدوں ہی پہ کاٹی ہے ابھی تک زندگی اپنی
کہاں گم ہو گئی آخر وہ حصہ کی خوشی اپنی
تبسم سے ترے دل کو ملی تابندگی اپنی
تری نظروں کے سایے میں کھلی ہے چاندنی اپنی
کوئی کب تک کیئے جائے مسلسل خودکشی اپنی
خرد سے انتقام دل ہے یہ دیوانگی اپنی
بتائے کیا وہ غم اپنا وہ کیا سمجھے خوشی اپنی
کہ جس نے زندگی اپنی نہ جانی زندگی اپنی
مرا غم دیکھ کر۔ میں اور کچھ تم سے نہیں کہتا
اگر یہ ہو سکے تم سے تو پی جانا ہنسی اپنی
تری محفل میں ہوں میں بھی مگر بیگانۂ محفل
کسی زنجیر میں جڑتی نہیں شاید کڑی اپنی
شب غم کی سیاہی اور بڑھ جاتی ہے اشکوں سے
کھٹکتی ہے اب اپنی آنکھ میں خود روشنی اپنی

نہ رکھ ہر در پہ سرِ ذوقِ جبیں آلودہ ہوتا ہے
نہ جانے کون کب مانگے مجھے دے بندگی اپنی

خزاں کے بعد کتنی ہی بہاریں باغ میں آئیں
نہ آنا تھی نہ آئی جا کے ہونٹوں پر ہنسی اپنی

ہجومِ یاس و حرماں کو بھی سینہ سے لگا لوں گا
جسے تم زندگی کہہ دو وہی ہے زندگی اپنی

غمِ افسردگی کیوں ہو سوارت ہو چکا جینا
ہوائے باغ میں حل ہو گئی ہے تازگی اپنی

محبت میں کوئی شے کامیابی ہے نہ ناکامی
نظر ملتے ہی اس سے زیست قیمت پا گئی اپنی

ہوا میں جیسے اک خوشبو سی ہے مرجھائے پھولوں کی
مگر ملاؔ کو یاد آئی ہے شامِ زندگی اپنی

نومبر ۱۹۴۰ء

(۵)

دُنیا خوشی میں غم کو بُھلاتی چلی گئی
اپنا فریب آپ ہی کھاتی چلی گئی

پردے حقیقتوں پہ گراتی چلی گئی
دل کے چراغِ عقل بجھاتی چلی گئی

مایوسیوں کی بزم میں یوں آ گئی اُمید
سوکھے بنوں میں آگ لگاتی چلی گئی

آتا رہا غموں میں بھی لب پر سرودِ زیست
اک جُوئے آب دشت میں گاتی چلی گئی

وہ التجائے دل جو زباں تک نہ آ سکی
اشکوں میں چھپ کے چشم تک آتی چلی گئی

جانِ بہار دل کی طرف بھی وہی نظر
جو ہر کلی کو پھول بناتی چلی گئی

اس شمع کی حیات بھی کوئی حیات ہے
جو اپنی لَو ہوا سے بچاتی چلی گئی

دنیا نہ عفو کر سکی مُلّا کی رسمِ عشق
لیکن اسی مذاق پہ آتی چلی گئی

دسمبر ۱۹۴۰ء

(۶)

رُخ اپنا آئینہ مجھ کو بنا کے دیکھ لیا
مری نگاہ کے پردے میں آ کے دیکھ لیا
جو دوست تھے انھیں دشمن بنا کے دیکھ لیا
زباں پہ دل کی تمنّا کو لا کے دیکھ لیا
حقیقتِ غمِ ہستی کے نقش مٹ نہ سکے
طلسم خانۂ ارمان بنا کے دیکھ لیا
وہ بے خبر مرے سوزِ جگر سے پھر بھی نہیں
ہر اک نگاہ پہ پردہ گرا کے دیکھ لیا
انھیں قبول نہیں عشق رائگاں اپنا
قدم قدم پہ نگاہیں بچھا کے دیکھ لیا
اب اور اس سے سوا چاہتے ہو کیا ملاؔ
یہ کم ہے اس نے تمھیں مسکرا کے دیکھ لیا

دسمبر ۱۹۴۰ء

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

تمہیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
تمہیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمہیں کو روح کی گہرائیوں میں دیکھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ——————

ہر ایک امید کا میری تمہیں ہو گہوارہ
تمہیں ہو جیسے ہر اک درد کا مرے چارہ
تمہیں پہ آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ
ہر ابتدائے محبت کا اختتام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ——————

میں کون ؟ اک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد
تم ایک بزم کی زینت تم اک چمن کی مراد
کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد
مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ــــــــــ

اُفق حیات کا پھر بھی تمہیں سے ہے زرّیں
ہر ایک بزمِ تصوّر تمہیں سے ہے رنگیں
تمہاری سمت ہے دل کی نگاہِ بازپسیں
اندھیری زیست کی اک زرنگار شام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ــــــــــ

کروں میں عرضِ تمنا مری مجال نہیں
سوال دل میں ہے اور جراتِ سوال نہیں
تمہاری یاد سے غافل مگر خیال نہیں
میں کچھ کہوں نہ کہوں حاصلِ کلام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ــــــــــ

خموشیوں میں ہے دمساز کون؟ تم جو نہیں
نظر نظر کا مری راز کون؟ تم جو نہیں
نفس نفس کی ہے آواز کون؟ تم جو نہیں
پیام بر ہوں اگر میں مرا پیام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ———————

کسی نگاہ کا جو دل غلام ہو نہ سکا
جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آج تک نہ جھکا
تمہارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا
تو کیا جہاں کا ملا سے انتقام ہو تم؟
سحر کی یاد ہو تم ———————

جنوری ۱۹۴۰ء

مسز حامد علی

(یہ نظم آل انڈیا ویمنز کانفرنس ۱۹۴۰ء کے سالانہ اجلاس میں جو الہ آباد میں
۲۷ جنوری کو زیر صدارت مسز حامد علی منعقد ہوا تھا حسب فرمائش پڑھی گئی تھی)

(۱)

پھر بہار آئی ہوا شاداب پھر بستانِ قوم — جمع اک مرکز پہ ہیں پھر آج خاتونانِ قوم

پھر نئی ضو ہے، نئے جلوے، نئے انوار ہیں — آج دیکھے تو کوئی آ کر رخِ تابانِ قوم

ان میں ہر دیوی ہر اک خاتون ہے اپنی جگہ — فخرِ قوم و نازِ قوم و روحِ قوم و جانِ قوم

اپنی بہنوں کی بہی خواہی ہے ان کا مدعا — ان کے تابع قوم ہے یہ تابعِ فرمانِ قوم

ایک دن ان کو ملے گا اپنی محنت کا صلہ — ایک دن مشکور ہوگی سعیِ بے پایانِ قوم

سوئے گلشن آئے گا پھر قیدیوں کا قافلہ — ایک دن توڑیں گی یہ قفلِ درِ زندانِ قوم

ان کے سینوں میں ہے پوشیدہ امانت قوم کی — ان کے چہروں سے ہے ظاہر جذبۂ پنہانِ قوم

ان کے ہونٹوں کا تبسم ہے خزانہ قوم کا — ان کی چمکیلی نگاہیں حاصلِ ارمانِ قوم

پھول ان کی گود کے چھینے بھی جائیں گے اگر — ان کے ہاتھوں سے نہ چھوٹے گا مگر دامانِ قوم

ان کی تصویروں سے ہوگی زینتِ محرابِ طاق — جب سجائی جائے گی پھر محفلِ ویرانِ قوم

ان کی قوت قوم کے بازو کی اب تسکین ہے
صنفِ نازک ان کو کہنا قوم کی توہین ہے

(۲)

لیجئے جلسہ میں گونج اٹھی وہ آوازِ وطن
ہو رہا ہے منکشف ہر ایک پر رازِ وطن

آج کے جلسے میں آئی ہیں صدارت کیلئے
کون وہ خاتونِ ذیشان مایۂ نازِ وطن

جان و دل سے قوم کی حامی مسز حامد علی
ہاں وہی جو ہیں علاجِ طبعِ ناسازِ وطن

ہاں وہی عباس طیب جی کی زندہ یادگار
وہ علمبردارِ آزادی وہ جانبازِ وطن

اپنی بہنوں کی ترقّی کے لئے کوشاں ہیں یہ
پھر رہی ہے ان کی نظروں میں تگ و تازِ وطن

ان کی ہر تحریر میں ہے ایک پیغامِ خلوص
ان کی ہر تقریر میں شامل ہے آوازِ وطن

گفتگو میں سحر ہے لیکن بحدِ اعتدال
دلکشی نظروں میں ہے لیکن باندازِ وطن

ان کی سیرت ہے فرشتوں کیلئے سامانِ رشک
ان کی صورت جلوۂ حسنِ خدا سازِ وطن

فخر سے ہاتھوں کو اپنے چومتا ہے بار بار
لوحِ دل ان کی بنا کر آئینہ سازِ وطن

ان کی ہر تصویر نقاشی کا ہے اک شاہکار
یہ مجسم آپ ہیں اک نغمۂ سازِ وطن

بزمِ انجم میں مثالِ ماہِ تاباں ہیں یہی
ایسی محفل کے لئے اک صدرِ شایاں ہیں یہی

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

توہینِ دوستی

سمجھ رہا ہوں میں خوب اس کو بھلا کہاں تو کہاں میں بیکس
مجھے کچھ اس کا گلہ نہیں ہے کہ فرق یہ تو نصیب کا ہے
زباں سے ملّا کو دوست کہکر مگر نہ توہینِ دوستی کر
ذرا خیالوں کا جائزہ لے کہیں گزر بھی غریب کا ہے
نہیں وہ تیرے کرم کے شایاں تو کیوں اُسے دے حسین دھوکا
کہ وہ سمجھ بوجھ کر ہے ناداں ہنوز امکاں فریب کا ہے

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

آثارِ وقت

ہر اک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

بدلنے کو ہے پھر نظامِ زمانہ
ہوا ختم وہ دورِ شاہنشہانہ
لبِ دہر پر ہے نیا اک فسانہ

ترانے نئے زندگی گا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــ

خفا اس تغیّر پہ جو ہو رہے ہیں
ابھی خوابِ غفلت میں جو سو رہے ہیں
زمانہ کی حالت پہ جو رو رہے ہیں

زمانہ کو ان پر ہنسی آ رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــ

یہ جھگڑا نہیں سلطنت سلطنت کا
نہ یہ تفرقہ مذہب و قومیت کا
تصادم یہ ہے ذہنیت ذہنیت کا
دلوں میں لڑائی لڑی جا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــ

ہر اک جہدِ ہستی میں یہ جلوہ گر ہے
اسی پر مدارِ اُمیدِ بشر ہے
کچھ ایسا جہانگیر اس کا اثر ہے
کہ دنیا سمٹتی چلی جا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــ

اِدھر اہلِ دولت کا جھنڈا گڑا ہے
اُدھر بے نواؤں کا ڈیرا پڑا ہے
جہاں دو قطاریں بنائے کھڑا ہے
زمیں جیسے گردوں سے ٹکرا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــ

یہی چاہتے ہیں جو ہیں اہلِ ثروت
ہے مٹھی میں جن کی عنانِ حکومت
کسی طور ہاتھوں سے جائے نہ طاقت
مگر پھر بھی طاقت چھنی جا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــــ

حکومت کا لیکن طریقہ نہ بدلا
پڑا ہے ابھی تک نگاہوں پہ پردا
ہے انداز اب بھی وہی گفتگو کا
وہی راگ گائے چلی جا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــــ

کبھی بھر کے آنکھوں میں چنگاریاں یہ
دیے جا رہی ہے ہمیں دھمکیاں یہ
کبھی بن کے اک مادرِ مہرباں یہ
کھلونوں سے بچوں کو بہلا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــــ

کبھی ناتوانوں کی دمساز بن کر
کبھی بے زبانوں کی آواز بن کر
کبھی خود مشیّت کی ہم راز بن کر
ہمیں نیک و بد خوب سمجھا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــــ

نہیں آتی جب کام تقریر کوئی
نہیں ٹھیک پڑتا ہے جب تیر کوئی
نہیں بنتی جب اور تدبیر کوئی
تو مذہب کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــــ

مگر وقت سے کون جیتا ہے بازی
کہیں موجِ طوفاں بھی رو کے ہے رکتی
تزلزل میں ہے قصرِ سرمایہ داری
فصیل اک نہ اک ٹوٹتی جا رہی ہے
ہر اک سمت ــــــــــــ

منظّم ہیں اب فاقہ مستوں کے لشکر
کڑے پڑ رہے ہیں غریبوں کے تیور
جو اُڑنے لگی تھیں حکومت کی شہ پر
اب ان چیونٹیوں کی قضا آ رہی ہے
ہر اک سمت ——————

لیے دل میں اک جذبۂ بے پناہی
نگاہوں میں اک جلوۂ صبح گاہی
ہے پھر کارواں نوعِ انساں کا راہی
مجھے اس کے قدموں کی چاپ آ رہی ہے
ہر اک سمت ——————

مساواتِ انساں کے بڑھ او سپاہی!
ترے نام دنیا کی ہے شہریاری
عروسِ جہاں ہو چلی نیم راضی
تری گرم نظروں سے شرما رہی ہے
ہر اک سمت ——————

فروری ۱۹۴۰ء

دو پھول

(۱)

صبح کو ایک ہی کیاری میں دو گلاب پھول رہے تھے
ایک ہی ڈالی کی پینگوں پر جھولا جھول رہے تھے
ایک ہی رات کے پردے میں اترا تھا ہرا دوپٹّا
ایک ہی شبنم کی برکھا نے دھویا گورا پنڈا
کلی پنے سے بڑے ہوئے تھے دونوں سنگ ہی سنگ
ایک ہی سورج کی کرنوں نے دیا تھا روپ اور رنگ
ایک ہی مٹی اور پانی سے نازک جسم بنا تھا
ایک ہوا کی گود میں جیون کا سپنا دیکھا تھا

(۲)

آئی ٹہلنے باغ میں اک چنچل مدھ ماتی نار
ایک کو اس نے توڑا اور بالوں کا کیا سنگھار

ڈالی سے بھی سوا لگا کچھ سر پر پھول وہ پیارا
جیسے بادل چیر کے ہنسدے کوئی روشن تارا
جیسے کالی پلکوں پر آنسو کا موتی دمکے
جیسے پربت کی چوٹی پر برف کی چاندی چمکے
جیسے ساگر کے جل تھل پر کوئی ٹاپو ابھرے
جیسے شیش پہ شنکر کے گنگا کی دھارا اترے

(۳)

دوسرا پھول لگے لگے ڈالی ہی پر کمھلایا
ترس ترس کر ہلکے ہلکے سارا روپ گنوایا
گرم اور تیز ہوا کے جھونکوں کی وہ تاب نہ لایا
سوکھ کے آخر ڈالی پر سے ٹوٹ کے خاک پہ آیا
خاک میں مل کر خاک ہوئیں وہ نازک پنکھڑیاں بھی
جن کو دیکھ کے جلتی تھیں اندر اسن کی پریاں بھی
اور تو اور اسی کیاری کی آنکھوں میں وہ کھٹکا
دور اسے لے جا کر مالی نے گھورے پر پٹکا

(۴)

پھیر یہ کیسا بھاگ کا ہے کیسی یہ جگ کی ریس ؟
ایک نظر کی جوت بڑھائے ایک جگر کی ٹیس
ایک کو اپنائے اور ایک کو آنکھ دکھائے باغ
ایک کو گھر کا دیا کہے اور ایک کو کُل کا داغ
ایک کا ہر ہر کنج میں چرچا ایک کو جائیں بھول
ایک کسی کے سر کا زیور ایک کے سر پر دھول
دو ..... گلاب ..... کے ..... پھول

اپریل ۱۹۴۰ء

اونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے
بیٹھے ہیں مقفّل کچھ انساں، انساں جو نہیں اک گنتی ہیں
ان کے بھی کبھی دن آئیں گے، ان پر بھی کرینگی لطف کبھی
وہ اندھی پریاں جو ہستی کا تانا بانا بنتی ہیں
ٹوٹے گا کبھی قفلِ زنداں جاگے گی کبھی سوئی قسمت
کچھ بیکس روحیں آس لگائے عمر کی گھڑیاں گنتی ہیں

اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

بلّی اور چوہا

(ماخوذ از ایلس ان ونڈر لینڈ، ALICE IN WONDER LAND)

یہ بلّی نے چوہے سے اک دن کہا — بہت تو نے مجھ کو پریشاں کیا
ارادہ ہے دعویٰ کروں تجھ پہ آج — نہیں ہے مجھے اور کچھ کام کاج
یہ ڈرتے ہوئے موش نے عرض کی — نہیں یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی
کوئی اس میں دھوکا ہوا ہے ضرور — کہیں مجھ میں آتی سکت ہے حضور
میں اور ایسی گستاخیاں کیا مجال — بدل ڈالیئے آپ اپنا خیال
بھلا فیصلہ کی یہاں کون راہ — نہ جج ہی کوئی ہے نہ کوئی گواہ
کہا اس سے بلّی نے چپ بدتمیز! — نہ کر رائگاں میرا وقت عزیز
کوئی اس میں تاخیر ممکن نہیں — یہ جھگڑا چکے گا ابھی اور یہیں

میں جج ہوں میں جوری میں ہی مدعی
سزا تجھ کو دیتی ہوں میں موت کی

دسمبر ۱۹۲۰ء

سنہ ۱۹۳۱ء

غزلیات

(۱)

یہ ربطِ عشق خود اک حدِّ فاصل ہوتا جاتا ہے
جو پردہ اُٹھتا جاتا ہے وہ حائل ہوتا جاتا ہے

زباں تک حرفِ دل لانا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے
یہ کیسا یا الٰہی رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

قدم رُک رُک کے کچھ پڑنے لگے ہیں جیسے رہرو کے
مجھے شک ہے کہ شاید قربِ منزل ہوتا جاتا ہے

جب سے حُسنِ بے پروا کہ حسرت بن چلی ارماں
نظر کی آڑ لے کر سامنے دل ہوتا جاتا ہے

نظر آنے لگا ہے شیخ کو ہر جا وہی جلوہ
یہ اب کافر کہے جانے کے قابل ہوتا جاتا ہے

نہیں لاتا ہے ظرفِ حُسن تابِ عاشقی شاید
جسے جتنا ہی چاہو اور قاتل ہوتا جاتا ہے

کسی سے عرضِ دل کرنا جو اک دنیا کو آساں ہو
نہ جانے کیوں یہی ملاّ کو مشکل ہوتا جاتا ہے

جنوری ۱۹۴۱ء

(۲)

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہے جاں اور
شعلہ کو دباتے ہیں تو اٹھتا ہے دھواں اور

انکار کیے جاؤ اسی طور سے ہاں اور
ہونٹوں پہ ہے کچھ اور نگاہوں سے عیاں اور

خود تو نے بڑھائی ہے یہ تفریق جہاں اور
تو ایک مگر روپ یہاں اور وہاں اور

دل میں کوئی غنچہ کبھی کھلتے نہیں دیکھا
اس باغ میں کیا آ کے بنائیگی خزاں اور

اتنا بھی مرے عہدِ وفا پر نہ کرو شک
ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور

ہر لب پہ ترا نام ہے اک میں ہوں کہ چپ ہوں
دنیا کی زباں اور ہے عاشق کی زباں اور

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا
آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

کچھ دور پہ ملتی ہیں حدیں ارض و سما کی
صحرائے طلب میں نہیں منزل کا نشاں اور

اک آہ اور اک اشک پہ ہے قصۂ دل ختم
رکھتی نہیں الفاظ محبت کی زباں اور

وہ صبح کے تارے کی جھپکنے سی لگی آنکھ
کچھ دیر ذرا دیدۂ انجم نگراں اور

ملاؔ وہی تم اور وہی کوئے حسیناں
جیسے کبھی دنیا میں نہ تھا کوئی جواں اور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

(۳)

خندہ بے اختیار چھوٹے ہے — یوں بھی غم کا پہاڑ ٹوٹے ہے

شامِ غم ہے بہ رنگِ دیدۂ تر — جیسے اک آبشار پھوٹے ہے

حسن اور عشق میں نہیں معلوم — کون لُٹتا ہے کون لُوٹے ہے

ہیں اسیر آج کچھ اُداس اُداس — ایک ساتھی قفس سے چھوٹے ہے

وہ نظر اب اِدھر نہیں آتی — کون لُوٹے ہوؤں کو لُوٹے ہے

نگہِ زخمہ زن کی چھیڑ گئی — سازِ دل اس طرح بھی ٹوٹے ہے

شاخِ دل پر جہاں لگے ہے تیر — نئی کونپل وہیں سے پھوٹے ہے

کیا کہیں اپنے دل کی بربادی — باغباں خود چمن کو لُوٹے ہے

مرگِ ملّا پہ کیوں نہ شادی ہو
ایک غمگین غم سے چھوٹے ہے

اپریل ۱۹۴۱ء

(۴)

ہوا ناسازگارِ گلستاں معلوم ہوتی ہے
اگر ہنستی بھی ہیں کلیاں فغاں معلوم ہوتی ہے

خوشی میں اپنی خوش بختی کہاں معلوم ہوتی ہے
قفس میں جا کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

ہر اک کے ظرف کی وسعت یہاں معلوم ہوتی ہے
محبت آدمی کا امتحاں معلوم ہوتی ہے

کبھی شاید محبت کا کوئی حاصل نکل آئے
ابھی تو رائگاں ہی رائگاں معلوم ہوتی ہے

یہ دل کو کر دیا کیسا کسی کی کم نگاہی نے
ذرا سی پھانس چبھتی ہو سناں معلوم ہوتی ہے

کھنچ آتی ہیں اُسی ساحل پہ خود دو اجنبی موجیں
محبت ایک جذبِ اماں معلوم ہوتی ہے

افق ہی پر ابھی تک ہیں تصور کی حسیں شامیں
کہیں ٹھہری ہوئی عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

تم اس حالت کو کیا جانو نہ جانو ہی تو اچھا ہے
ہنسی جب آ کے ہونٹوں پر فغاں معلوم ہوتی ہے

تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی گراں معلوم ہوتی ہے

نظر آتا نہیں شبنم کا گرنا پھول کا کھلنا
محبت کی حقیقت ناگہاں معلوم ہوتی ہے

چمن کا درد ہے جس دل میں تو چاہے کہیں اُٹھے
اُسے اپنی ہی شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نظر پھرتی تھی وہ پہلے بھی لیکن یوں نہ پھرتی تھی
کچھ اب کی ختم ہوتی داستاں معلوم ہوتی ہے

ابھی خاکسترِ دل سے اُٹھتا ہے دھواں کچھ کچھ
کہیں پر کوئی چنگاری تپاں معلوم ہوتی ہے

مئی ۱۹۴۱ء

(۵)

ارمانوں پہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی سی
تاروں کو سرِ شام ہی نیند آئی ہوئی سی

آغازِ محبت میں عجب دل کا ہے عالم
جیسے کہ دُلہن ہو کوئی شرمائی ہوئی سی

دنیا ہے محبت کی حقیقت سے خبردار
اور پھر بھی محبت پہ یقین لائی ہوئی سی

شاید کسی قابل ہو مری نذرِ محبت
یہ ایک زمانہ کی ہے ٹھکرائی ہوئی سی

پھر جہلِ گزشتہ کی ہے دُنیا متلاشی
دانائیِ امروز سے گھبرائی ہوئی سی

گل رشک کے قابل ہے ترا فلسفۂ زیست
دل چاک مگر لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ملاؔ ہے کسی سوچ میں اس وقت نہ چھیڑو
اک بھولنے والے کی ہے یاد آئی ہوئی سی

اگست ۱۹۴۱ء

(۶)

اُس کے کرم پہ شک تجھے زاہد ضرور ہے / ورنہ ترا قصور نہ کرنا قصور ہے

موسیٰ یہی نظر ہے اسی دل میں طور ہے / ہاں عام اک غلط سی روایت ضرور ہے

اک درس ہے تری غلط اندازیِ نگاہ / کوئی نہ زد میں ہے نہ کوئی زد سے دور ہے

آزردگی کا میری خموشی پہ شک نہ کر / یہ اور بات ہے کہ محبت غیور ہے

کشتی کے ڈوبنے کا گلہ ناخدا نہیں / کشتی کو چھوڑنے کی شکایت ضرور ہے

نفرت کا دل کو دیتی ہے دھوکا کبھی کبھی / وہ عشق کی کشش جو ابھی لاشعور ہے

بس دیکھنے ہی میں ہیں نگاہیں کسی کی تلخ / شیریں سا اک پیام بھی بین السطور ہے

دل ہی کی تربیت پہ ہے مُلّا مدارِ زیست
ہے غمکدہ یہی، یہی دار السرور ہے

ستمبر ۱۹۴۱ء

سماج کا شکار

(۱)

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

اک سال سے ہر روز وہ مزدور کا بیٹا
آتا تھا اِدھر شام ہو دن ہو کہ سویرا
دو روز سے لیکن اُسے میں نے نہیں دیکھا
معلوم نہیں اس کو یکایک یہ ہوا کیا

اب تک اُسے آنے سے کبھی روک پائے
تپتی ہوئی گرمی میں بھی وہ لُو کے تھپیڑے
سردی کی ہواؤں کے وہ اُڑتے ہوئے نیزے
برسات کی جھڑیاں ہی نہ بجلی ہی نہ اولے

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(۲)

دروازہ سے کچھ دور جو اُس پار گلی کے
اک پیڑ ہے پیپل کا اسی پیڑ کے نیچے
میں نے تو ہمیشہ اُسے پایا یہیں بیٹھے
کچھ چپ سا کچھ آزردہ سا کھویا ہوا جیسے
جی کی نہ کبھی اُس نے کسی کو بھی بتائی
سب چھوٹے بڑے اس کو سمجھتے رہے خبطی
مانی نہ بری اس نے کوئی بات بھی کڑوی
سب ہنستے تھے جب اُس پہ تو ہنس دیتا تھا وہ بھی
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(۳)

دن آیا تھا پرسوں جو مری سال گرہ کا
معلوم نہیں کس نے اُسے جا کے بتایا
جاتی تھی شوالے کو میں جب کرنے کو پوجا
اُس نے مجھے لا کر دیا اک پھولوں کا مالا

میں بڑھ گئی جلدی سے لیا میں نے نہ مالا
کچھ اُس نے کہا اور نہ کچھ میں نے ہی پوچھا
مجھ کو یہ گوارا نہ تھا شاید وہ یہ سمجھا
پلٹی تو مجھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(۴)

دربان نے کیا جانیئے کیا دور سے دیکھا
اور جا کے پتا جی سے نہ معلوم کہا کیا
غصہ میں گئے منھ میں جو آیا وہ سُنایا
چپ چاپ وہ سُنتا رہا کچھ منھ سے نہ بولا
کی میں نے شکایت کہیں وہ یہ تو نہ سمجھا
خود اُس نے کوئی عذر کیا اور نہ شکوا
بدنام پتا جی کو کیا اور سدھارا
اور جب کا گیا پھر وہ پلٹ ہی کے نہ آیا
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(۵)

کیا دے گئی دھوکا اُسے سچ مچ یہ کُھدائی
ناداں تھا کیا کہ نہ سمجھا مرے جی کی
یہ شرم بھی جھوٹی ہے یہ تہذیب بھی جھوٹی
اے کاش کہ ہوتی نہ مہاجن کی میں بیٹی

چنگل میں دبائے ہے یہ خونخوار سماج آہ!
قیدی ہے بشر اور ہے دیوار سماج آہ!
قربانی کی ہم بھیڑیں ہیں تلوار سماج آہ!
جینے نہیں دیتی ہے یہ مردار سماج آہ!
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(۶)

اک بار وہ پھر آئے تو کیا کیا نہ کروں گی
سچ کہتی ہوں دُنیا کی میں پروا نہ کروں گی
رسوا ہوں تو ہوں شوق کو رسوا نہ کروں گی
کھاتی ہوں قسم اب کبھی ایسا نہ کروں گی

جاں ہوتی ہے پیاری مجھے اس کا تو یقیں ہے
دُنیا بھی جوانی کی نگاہوں میں حسیں ہے
لیکن وہ جہاں رہتا تھا رُونا یہ وہیں ہے
جو دل میں مرے شک ہے کہیں سچ تو نہیں ہے

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

مارچ ۱۹۴۱ء

اندھی لڑائی

کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں

کوئی ان سے پوچھے لڑائی یہ کیوں ہے
مذاقِ نبرد آزمائی یہ کیوں ہے
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں ہے
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

عدو کون ہے اور حمایت ہے کس کی
خصومت ہے کس سے رفاقت ہے کس کی
مٹانا ہے کس کو حفاظت ہے کس کی
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

حقیقت میں سب اختلافات کیا ہیں
جہاں کے اصولی نزاعات کیا ہیں
جو کرنے ہیں حل وہ سوالات کیا ہیں

نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ـــــــــــــــ

یہ پیکار جو ہیں وہ اغراض کیا ہیں
مریضِ تمدّن کے امراض کیا ہیں
لڑائی کی تہہ میں نہاں راز کیا ہیں

نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ـــــــــــــــ

صداقت پہ اُٹھی ہے تلوار کس کی
ہے اک دامِ تزویر گفتار کس کی
جو جیتے تو اس میں ہوئی ہار کس کی

نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ـــــــــــــــ

غلامِ حکومت بندے لڑ رہے ہیں
تمدّن کے جھگڑے ہوئے لڑ رہے ہیں
نہیں جانتے کس لئے لڑ رہے ہیں
مگر لڑنے والے لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ———

جو دیکھیں ذرا غور سے اک نظر بھر
تو کھل جائے ہے کون پردے کے اندر
وہی اہلِ دولت خود اپنی غرض پر
غریبوں کو قرباں کئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ———

فریبِ دلائل سے بہکا کے ان کو
سرابات کی سمت لے جا کے ان کو
نزاعاتِ باطل میں اُلجھا کے ان کو
حقیقت چھپائے چلے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ———

کہیں بن کے اک دورِ نو کے پیمبر
کہیں تازہ کر کے مذاقِ سکندر
کہیں حبِّ قومی کا بہروپ بھر کر
زمانے کو دھوکے دیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

کسی طور رائج نہ یکسانیت ہو
نہ بیدار تقدیرِ انسانیت ہو
جو ہوتی ہو تجدیدِ حیوانیت ہو
یہ اپنی سی لیکن کیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

کمی ہے نہ غلّہ کی کھیتوں میں کوئی
ترقّی پہ ہے علم اور آگہی بھی
جہاں کی ضرورت کو ہر شے ہے کافی
بشر پھر بھی بھوکے مرے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

جو دل تھے کبھی بے قرارِ محبّت
جو تھے مایۂ صد بہارِ محبّت
جو بن سکتے تھے نغمہ زارِ محبّت
وہ نفرت کدے اب بنائے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

جسے خوابِ راحت بنانا تھا ممکن
جسے نازِ قدرت بنانا تھا ممکن
جہاں جس کو جنّت بنانا تھا ممکن
اسے اک جہنّم کیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

تشدّد کی کب تک یہ فرماں روائی
لٹیروں کے قبضہ میں کب تک خدائی
ارے آہِ بیکس کی یہ نارسائی
دلوں کے عقیدے ہلے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

کبھی امن کا دور آئے گا آخر
نظامِ تشدّد یہ ٹوٹے گا آخر
کبھی خونِ انساں بھی کھولے گا آخر

اسی آس پر ہم جیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ——————

مگر ان سوالوں پہ کس کی نظر ہے
گہن میں ابھی آفتابِ بشر ہے
مقابل ہے کوئی بس اتنی خبر ہے

اک اندھی لڑائی لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں

اگست ۱۹۴۱ء

نذرِ ٹیگور

خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا

تجھے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سحر کی مست ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں

کہ ذرّہ ذرّہ پہ برسا ہے ابرِ جام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــ

تجھے فروغِ بصیرت سے دیکھنا چاہا
اُبھر کے عقل کی ظلمت سے دیکھنا چاہا
تجھے حیات کی رفعت سے دیکھنا چاہا

نظر کو مل نہ سکا پھر بھی اوجِ بام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــ

بلند طائرِ سدرہ سے آشیاں تیرا
نظامِ شمس و قمر پیشِ آستاں تیرا
ستارے روندتا چلتا ہے کارواں تیرا
کہ روحِ قدس کے پہلو میں ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــ

جہاں کے دشت میں تخئیل جس کے آیا ہے تو
ابھی جو تشنۂ تعبیر ہے وہ خواب ہے تو
اُفق پہ ہے جو دلوں کے وہ آفتاب ہے تو
ابھی دیارِ شفق میں ہے دورِ جام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــ

شبیہِ حُسن ہے تیرے نگارخانوں میں
سرودِ عشق جواں ہے ترے ترانوں میں
حیات رقص کناں ہے ترے فسانوں میں
کہ اک بہشتِ ترنّم ہے یا کلام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــ

ہے گونج نے میں تری سرمدی ربابوں کی
ترے نفس میں مہک جنّتی گلابوں کی
تری نظر میں ہے دنیا بشر کے خوابوں کی
ہر اک طلوعِ سحر میں ہے عکسِ شام ترا
خوشا وہ یاد ——————

کدورتوں پہ سدا خاک ڈالنے والا
خصومتوں کو محبت میں ڈھالنے والا
دلوں سے درد کا کانٹا نکالنے والا
سکون و امن کا حامل ہے ہر پیام ترا
خوشا وہ یاد ——————

حیاتِ فانیِ انساں کی انتہا ہے جہاں
مسرّتِ ابدی دل سے آشنا ہے جہاں
بشر کی رُوح کی تکمیلِ ارتقا ہے جہاں
وہاں سے نور فشاں ہے سہیلِ جام ترا
خوشا وہ یاد ——————

وطن میں دھوم ہے ہر سمت اوستادوں کی
بساطِ شعر پہ اک فوج ہے پیادوں کی
تجھی پہ ختم ہوئی نسل دیوزادوں کی
ادب کے کوہِ ہمالہ پہ ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــ

وہ زیست پائی کہ اک کائنات رشک کرے
وہ خوبیاں تھیں کہ ہر ذی صفات رشک کرے
ملی وہ موت کہ جس پر حیات رشک کرے
یہ بزمِ سوگ ہے تیری کہ جشنِ عام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا

نومبر ۱۹۴۱ء

قطعِ محبّت

میں جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا
تمہیں پسند نہیں طرزِ گفتگو میرا
تمہیں قبول نہیں ذوقِ جستجو میرا
تمہیں عزیز نہیں خوابِ آرزو میرا
میں تم پہ جبرِ مروّت روا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ——————

مرا نیاز، مرا عشق رائگاں ہے اگر
مری نگاہِ محبت تمہیں گراں ہے اگر
جبینِ شوق مری ننگِ آستاں ہے اگر
تمہارے در پہ سرِ مدّعا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ——————

نہیں تمہارے خیالوں میں جب گزر میرا
تمہارے دل میں نہیں جب مری کوئی پروا
تمہارے پاس نہیں جب مرے لئے کوئی جا
میں تم سے دور کا بھی سلسلا نہ رکھوں گا
میں جاؤں تم سے ——————

مے عنب کے لئے جام گِل نہیں شایاں
شعاعِ مہر نہیں بہرِ حجرۂ زنداں
نسیمِ باغ کہاں اور قفس نصیب کہاں
کسی امید کی اب دل میں جا نہ رکھوں گا
میں جاؤں تم سے ——————

یہ سچ ہے اس میں اذیّت ضرور ہوتی ہے
طبیعت اور بھی کچھ ناصبور ہوتی ہے
میں کیا کروں کہ محبّت غیور ہوتی ہے
اسے ذلیل کروں یہ روا نہ رکھوں گا
میں جاؤں تم سے ——————

یہ ٹھیک ہے کہ محبّت بدل نہیں سکتی
وفا سرشت کی فطرت بدل نہیں سکتی
کسی کے دل کی حقیقت بدل نہیں سکتی
مگر میں تم سے کوئی آسرا نہ رکھّوں گا
میں جاؤ تم سے ——————

گو اب وہ سلسلۂ نامہ و پیام نہیں
مری حدیثِ تمنّا مگر تمام نہیں
مزاجِ عشق میں سودائے انتقام نہیں
مجھے قسم ہے کہ دل میں گِلا نہ رکھّوں گا
میں جاؤ تم سے ——————

میں دل ہی دل میں سجاؤں گا ایک بزمِ خیال
جہاں نہ گردِ کدورت ہے اور نہ رنگِ ملال
جسے نہ خوفِ تغیّر ہے اور نہ بیمِ زوال
تمہیں بھی اس سے مگر آشنا نہ رکھّوں گا
میں جاؤ تم سے ——————

شبِ حیات کو دوں گا یہاں نویدِ سحر
یہاں بچھاؤں گا گلہائے شوق کی چادر
یہاں لٹاؤں گا دل کے عقیق و لعل و گہر
یہاں میں کوئی بھی ارماں اٹھا نہ رکھوں گا

میں جاؤ تم سے ——————

یہاں وہ شمعیں جلاؤں گا جو جلا نہ سکا
پڑھوں گا شعر جو تم کو کبھی سنا نہ سکا
وہ گیت گاؤں گا جو تارِ جاں پہ گا نہ سکا
میں کوئی ساز یہاں بے صدا نہ رکھوں گا

میں جاؤ تم سے ——————

حقیقتوں نے کیا چاک زیست کا داماں
بس اک فریبِ تصور ہی اب ہے راہِ اماں
اسے بھی ہاتھ سے کھو دوں تو جاؤں گا میں کہاں
نہیں نہیں اسے ہرگز روا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

نومبر ۱۹۴۱ء

ایک البم میں

ارے او صفحۂ کاغذ یہی منشائے فطرت ہے
مری اور تیری یکجائی میں پنہاں دستِ قدرت ہے
حیاتِ جاوداں دونوں کو ملنا اب یقینی ہے
اگر شک ہے تو اس میں ہے کہ کس کی بدولت ہے

دسمبر ۱۹۴۱ء

۱۹۳۲ء

غزلیات

(۱)

شمع و گل و سرود و مے بزم میں یوں تو کیا نہیں
بزم تھی جس کے دم سے بزم، آہ وہ آشنا نہیں

بات بھی کہہ کے کھوؤں کیوں جب کوئی آسرا نہیں
ہاں مجھے کوئی غم نہیں، ہاں مجھے کچھ گلا نہیں

عشق بغیر زیست حیف! جینے میں کچھ مزا نہیں
نغمے ہیں اور رس نہیں، اشک ہیں اور ضیا نہیں

تم وہی، میں وہی مگر دل میں وہ ولولا نہیں
آتشِ تیزِ عشق میں شعلۂ دیرپا نہیں

چھیڑ کے دل کو دیکھ لو نغمۂ جاں سنائے گا
ساز فقط خموش ہے یہ ابھی بے صدا نہیں

توڑ کے دل کی ہر امید پوچھ رہے ہیں چپ ہو کیوں
اور وہ ہنس کے اس طرح جیسے کہ کچھ ہوا نہیں

سونی پڑی ہے بزمِ دل تیرہ دتا رہے نظر
کب سے سرائے شوق میں کوئی دیا جلا نہیں

ہوگئی ہونے والی بات جانے بھی دو اثر نہ لو
تم بھی وہی کے ہو وہی میں کوئی دوسرا نہیں

گل نہیں بوئے گل سہی سوئے قفس بھی ہاں کبھی
باغ کی فصلِ گل پہ کیا کوئی بھی حق مرا نہیں

ننگ ہے ذوقِ عشق کو جادۂ قیس و کوہکن
ڈھونڈ رہا ہوں راہ وہ جس میں نقوشِ پا نہیں

ہو چکی التجا تمام بن چکے اشکِ خوں سفید
ملا انھیں مگر ابھی وہ ان میں کچھ اب رہا نہیں

اپریل ۱۹۴۲ء

(۳)

آنا ہے تو آ دن جاتے ہیں پھر عشق کا یہ پیغام کہاں
بالفرض رہا بھی عشق اگر یہ دل کی سنہری شام کہاں

پی لے جتنی پینا ہے ابھی آتی ہے پلٹ کر شام کہاں
جب صبح نے آکر دستک دی پھر شیشہ کہاں اور جام کہاں

اے دل آ چھوڑ دیں دنیا کو دنیا میں ہماری جا ہی نہیں
اس نیک چلن آبادی میں تجھ سے ہم سے بدنام کہاں

مقصد کے لئے جہدِ پیہم، جینا ہے یہی باقی باتیں
آرام کے جویا ہم بھی تھے دنیا میں مگر آرام کہاں

بجلی سی یکایک کوند گئی، برچھی سی اچانک آن لگی
آنکھوں میں جھپک سی باقی ہے وہ جلوہ نمائے بام کہاں

خلوت میں حرم کی آ ہی گیا کچھ سوچ سمجھ کر آخر میں
کافر دنیا میں اور کہیں یہ تذکرۂ اصنام کہاں

اُلفت کی توقع کرتا ہے اور اس سے اسے یہ نادانی
ملا ملا کچھ ہوش میں آ، پہونچا ہے خیالِ خام کہاں

اگست ۱۹۴۲ء

(۳)

محبت سے بھی کارِ زندگی آساں نہیں ہوتا
بہل جاتا ہے دل غم کا مگر درماں نہیں ہوتا

کلی دل کی کھلے افسوس یہ ساماں نہیں ہوتا
گھٹائیں گھر کے آتی ہیں مگر باراں نہیں ہوتا

محبت کے عوض میں او محبت ڈھونڈنے والے
یہ دنیا ہے یہاں ایسا ارے ناداں نہیں ہوتا

دلِ ناکام اک تو ہی نہیں ہے صرف مشکل میں
اُسے انکار کرنا بھی تو کچھ آساں نہیں ہوتا

ہنسی میں غم چھپا لینا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
جو غم دراصل غم ہوتا ہے وہ پنہاں نہیں ہوتا

زمانہ نے یہ تختی کشتِ ارماں پر لگا دی ہے
گُل اس کیاری میں آتا ہے مگر خنداں نہیں ہوتا

کہیں کیا تم سے ہم اپنے دلِ مجبور کا عالم
سمجھ میں وجہِ غم آتی ہے اور درماں نہیں ہوتا

مآلِ اختلافِ باہمی افسوس کیا کہیئے
ہر اک قطرہ میں شورش ہے مگر طوفاں نہیں ہوتا

دیارِ عشق ہے یہ ظرف دل کی جانچ ہوتی ہے
یہاں پوشاک سے اندازۂ انساں نہیں ہوتا

غرورِ حسن تیری بے نیازی شانِ استغنا
جبھی تک ہے کہ جب تک عشق بے پایاں نہیں ہوتا

صدائے بازگشت آتی ہے ایامِ گزشتہ کی
یہ دل ویران ہو جانے پہ بھی ویراں نہیں ہوتا

محبت تو بجائے خود اک ایماں ہے ارے ملّا
محبت کرنے والے کا کوئی ایماں نہیں ہوتا

ستمبر ۱۹۴۲ء

صبح کا ہنگام ہی ہنگام کی باتیں کریں

وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں
تا بہ کے اپنے دلِ ناکام کی باتیں کریں

پھر اُفق ہے ایک صبحِ نو سے رشکِ لالہ زار
شمعِ افسردہ لیے کیا شام کی باتیں کریں

کارواں پھر زندگی کے موڑ پر ہے گرم رو
کس طرح ہم سجدۂ ہر گام کی باتیں کریں

ہر نفس ہے تیز سے کچھ تیز تر رفتارِ زیست
اب نہیں فرصت کہاں آرام کی باتیں کریں

خونِ انساں سے لبالب آج ہے جامِ حیات
کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں

لکھ رہی ہے تیغِ خوں آشام تاریخِ جہاں
اور ہم اک بزمِ مے آشام کی باتیں کریں

زندگی کی تلخیوں سے پھیر کر کب تک نگاہ
شاہد و شمع و شراب و جام کی باتیں کریں

نغمہ ہائے آشیاں ہونے لگے کانوں پہ بار
اب چمن میں مرغِ زیرِ دام کی باتیں کریں

مضطرب دل کے فسانے اب مزا دیتے نہیں
اک زمینِ لرزہ براندام کی باتیں کریں

زندگی نے توڑ ڈالے وہ پرانے بت تمام
طاقِ نو ڈھونڈیں نئے اصنام کی باتیں کریں

جس میں شامل ہو ہر اک ٹوٹے ہوئے دل کی فغاں
آؤ اب اس نغمۂ ایام کی باتیں کریں

اب گھنے سایوں کا پھولوں کی روش پر ذکر کیا
ایک تپتی شاہراہِ عام کی باتیں کریں

پختگیِ عقل اچھی ہے مگر بہتر ہے یہ　　گاہے گاہے آرزوئے خام کی باتیں کریں

رفعتوں سے دردِ انساں کی بھی چھیڑیں گفتگو　　تا بہ کے پستیٔ ذوقِ عام کی باتیں کریں

شیخ جی ملا پہ لعنت بھیجئے کافر ہے وہ
آیئے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں

اگست ۱۹۴۲ء

ترکِ محفل

دنیا سے کنارہ کر کے الگ بیٹھے ہیں اکیلے دل کو لیے
محفل سے بظاہر دور رہیں ہم دل میں ہیں مگر محفل کو لیے

کھولا نہ کسی نے دروازہ آخر تھک کر خاموش ہوئے
کب تک دیتے ہر در پہ صدا اک خواہشِ لاحاصل کو لیے

دیوانہ ہمیں سمجھا سب نے دی پاس کسی نے بھی نہ جگہ
آخر محفل چھوڑی ہم نے لیکن سازِ محفل کو لیے

اک آنکھ میں بھی ہم کو نہ ملی ڈھونڈے سے بھی ہمدردی کی چمک
کتنی راتوں سے ہم گزرے بس ایک چراغِ دل کو لیے

معتوب ہیں ہیں نظروں میں بیزار ہمیں سے محفل ہے
وہ ہم جو ہیں اس محفل کے لیے صد جلوۂ مستقبل کو لیے

گرمیِ محبت کو اپنی لے جا کے وہاں کیا خوار کریں
ٹھٹھرے سے کچھ انساں ہیں جہاں سیلے سے ہوئے اک دل کو لیے

اک فکر یہی ہے بس جن کو کھل جائے کہیں ان کا نہ بھرم
سب شاہ بنے بیٹھے ہیں جہاں اک جور سے اپنے دل کو لیے

بازارِ جہاں میں ہو بھی چکی تبدیلی قدرِ اشیار کی
یہ بھولے سوداگر ہیں مگر اب تک نرخِ باطل کو لیے

زندانِ بشر کب تک چھوٹے اخلاق کی خستہ دیواریں
اک دن یہ کھنڈر ڈھ جائے گا تعمیر کی ہر منزل کو لیے

سطحِ بحرِ ذہنِ انساں طوفاں آثار ہے پھر کچھ بلد ل
ہر بّرِ تمدّن لرزاں ہے اپنے اپنے ساحل کو لیے

لیلائے حقیقت کے شیدا اس دشت میں جا کر کیوں بھٹکیں
رسمی مجنوں سوتے ہیں جہاں اک خوابِ پسِ محمل کو لیے

جو راہ چنی ہے اپنے لئے ہٹنے کے نہیں اب اس سے قدم
مٹنا ہے تو ہاں مٹ جائیں گے لیکن خوابِ منزل کو لیے

محفل سے اٹھ آئے ہیں ملّا لیکن دل کا عالم ہے وہی
جس کو اب تک حل کر نہ سکے بیٹھے ہیں اسی مشکل کو لیے

ستمبر ۱۹۴۲ء

امن کے سپاہی

ابھی فضائے جہاں میں غبار ہیں کیا کیا — مگر انھیں میں نہاں شہ سوار ہیں کیا کیا

نشیبِ صلح میں سیلابِ جنگ کے آگے — قدم جمائے ہوئے کوہسار ہیں کیا کیا

ہر ایک سمت ہیں گو سنگلاخ چٹانیں — ترانہ بار مگر آبشار ہیں کیا کیا

جہادِ زیست کے تپتے ہوئے بیاباں میں — اٹھائے سر شجرِ سایہ دار ہیں کیا کیا

کثیف چھینٹے زخمی بدن پہ چہرہ چاک — غبارِ خوں کی تہوں میں نگار ہیں کیا کیا

چھپائے زخمِ جگر کو تبسمِ لب سے — محاذِ زیست پہ سینہ فگار ہیں کیا کیا

دلیر مرد فقط جنگجو صفوں میں نہیں — سپاہِ امن میں بھی جاں نثار ہیں کیا کیا

مگر وہ معرکۂ زندگی کے میداں میں — تن اسلحہ سے سجائے ہوئے نہیں ملتے

مصافِ زیست کی خونریز رزمگاہوں میں — لہو میں ہاتھ رچائے ہوئے نہیں ملتے

شبِ حیات کی پُرہول تیرگی میں بھی وہ — چراغِ روح بجھائے ہوئے نہیں ملتے

جلائے آتشِ نفرت کو اپنے سینوں میں — نظر میں زہر بجھائے ہوئے نہیں ملتے

کشادہ کر کے خصومت کا ہر جنوں خانہ — دلوں پہ قفل چڑھائے ہوئے نہیں ملتے
خدائے جبر و تشدّد کے آستانے پر — سرِ نیاز جھکائے ہوئے نہیں ملتے
کہیں کہیں مترنّم ہے ان کے دم سے ہوا — ابھی فضا پہ وہ چھائے ہوئے نہیں ملتے

ابھی تمام نہیں داستانِ حرص و ستم — ابھی سکندر و اسفندیار ہیں کیا کیا
نہیں ہے کامِ بشر آشنائے لذتِ مے — لہو کے گھونٹ ابھی خوشگوار ہیں کیا کیا
ابھی نظر نہیں جاتی تہہِ حقیقت تک — خزاں کے دور بہ رنگِ بہار ہیں کیا کیا
چڑھائی جاتی ہے انسانیت کی بھینٹ جنھیں — ابھی سماج کے پروردگار ہیں کیا کیا
دبا ہوا ہے خدائی کے بوجھ سے انساں — ابھی زمین پہ گردوں کے بار ہیں کیا کیا
فقط ہلاکِ اجل ہی نہیں ہے آدم زاد — ابھی حیات کے زندہ شکار ہیں کیا کیا

ابھی ہے دور بہت بامِ ارتقائے حیات
دلِ بشر کو ابھی انتظار ہیں کیا کیا

نومبر ۱۹۴۲ء

۱۹۴۳ء

غزلیات

(۱)

ساتھ ہو کوئی تو کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں
تیرے آگے جا کے تنہا اور گھبراتا ہوں میں

سامنے آتے ہی ان کے چپ سا ہو جاتا ہوں میں
جیسے خود اپنی تمناؤں سے شرماتا ہوں میں

اک مسلسل ضبط ہی کا نام شاید عشق ہے
اب تو نظروں تک کو آنکھوں ہی میں پی جاتا ہوں میں

دیکھ سکتے کاش تم میری تمناؤں کا جشن
جب انھیں جھوٹی امیدیں دے کے بہلاتا ہوں میں

میرے پیروں کو ہے کچھ روندی ہوئی راہوں سے بیر
جس طرف کوئی نہیں جاتا ادھر جاتا ہوں میں

اک نگاہِ لطف آتے ہی وہی ہے حالِ دل
سب پرانے تجربوں کو بھول سا جاتا ہوں میں

یہ مرے اشکِ مسلسل بس مسلسل اشک ہیں

کون کہتا ہے تمہارا نام دہراتا ہوں مَیں

شامِ غم کیا کیا تصوّر کی ہیں چیرہ دستیاں

ہاں تمہیں بھی تم سے بن پوچھے اُٹھا لاتا ہوں مَیں

کاروبارِ عشق میں دنیا کی جھوٹی مصلحت

مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور دل کو سمجھاتا ہوں مَیں

ساتھ تیرے زندگی کا وہ تصوّر ہیں سفر

جیسے پھولوں پر قدم رکھتا چلا جاتا ہوں مَیں

رنجِ انساں کی حقیقت میں تو سمجھا ہوں یہی

آج دنیا میں محبّت کی کمی پاتا ہوں مَیں

میرے ہر آنسو میں خوشبو میرے ہر نالہ میں راگ

اب تو ہر ہر سانس میں شامل تمہیں پاتا ہوں مَیں

اب تمنا بے صدا ہے، اب نگاہیں بے پیام

زندگی اک فرض ہے جیتا چلا جاتا ہوں مَیں

ہائے ملّاؔ کب ملی خاموشیِ اُلفت کی داد

کوئی اب کہتا ہے کچھ اُن سے تو یاد آتا ہوں مَیں

فروری ۱۹۴۳ء

(۲)

نہ عقل کے کوہِ نور پر ہے نہ دیں کی وادیِ راز میں ہے
بشر کی سب سے جمیل تصویر دل کے سوز و گداز میں ہے
نکل کے خلوت سے کون جلوہ مشاہدہ گاہِ ناز میں ہے
کہ آج گھر گھر چراغ روشن دیارِ اہلِ نیاز میں ہے
حیاتِ انساں نئی نظر سے پھر آج تفتیشِ راز میں ہے
خیال سانچے بدل رہے ہیں ضمیرِ ہستی گداز میں ہے
یہی تقاضائے زندگی ہے اسی لئے خونِ گرم دل ہے
حقیقتوں کو بھی رنگ دیدے وہی جو روئے مجاز میں ہے
کھڑا ہوں میں پیشِ حسن حیراں ابھی ہیں بے لوث دل کے سجدے
دعا بھی آجائے گی زباں تک ابھی تمنا نماز میں ہے
وہ نور ہی کیا بلندیوں ہی کو جو فقط زرنگار کردے
جمالِ خورشید کی حقیقت شعاعِ ذرّہ نواز میں ہے
کسی کو اپنے جمالِ رُخ کا کہیں نہ اندازہ غلط ہو
مجھے تو شک ہے وہ آئینہ ہے جو ذہنِ آئینہ ساز میں ہے

مریضِ غم کو تسلیوں سے کہیں سوا دے رہا ہے تسکیں
وہ اک چمکتا ہوا سا آنسو جو دیدۂ چارہ ساز میں ہے

لبِ دگلو میں جو ڈھل نہ پایا، جو صوتِ نَے میں سما نہ پایا
سرودِ خاموش ایک وہ بھی دلِ شکستہ کے ساز میں ہے

ہزار سجدے کرو میسّر مگر دوبارہ نہیں یہ نعمت
وہ ایک فردوسِ کیف و مستی جو دل کی پہلی نماز میں ہے

خدائے انصاف تجھ سے پوچھوں اسے اگر تو گلہ نہ سمجھے
خوشی کا دھندلا سا کوئی تارا ابھی غم کی شامِ دراز میں ہے

ابھی مرے دل میں کچھ ستارے ہیں جو نظر تک نہ آسکے ہیں
مری خموشی پہ تم نہ جاؤ سرودِ خوابیدہ ساز میں ہے

یہی تو اُس در پہ اُن کے سجدے قبول ہونے سے روکتی ہے
وہ ایک در پردہ تمکنت سی جو عجزِ اہلِ نیاز میں ہے

فریبِ تحسینِ عام کھا کر سمجھ نہ کانٹوں کو پھول ملّا
کہ گل تو دراصل گل وہی ہے جو دامنِ امتیاز میں ہے

مارچ ۱۹۴۳ء

(۴)

اجنبیت سی نگاہِ دوست میں پاتے ہوئے
اُٹھ گئے محفل سے ہم نظروں کو کتراتے ہوئے

اک ترانہ زیست کا شام و سحر گاتے ہوئے
جی رہے ہیں موت کو ہنس ہنس کے ٹھکراتے ہوئے

عقل کے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلاتے ہوئے
ہم نے کاٹی زندگی دیوانہ کہلاتے ہوئے

ابتدائے عشق میں نظروں کا عالم اُس سے پوچھ
جس نے دیکھی صبحدم کرنوں میں تاب آتے ہوئے

شمع دل کی لَو کی ہر جنبش انہیں کے دم سے تھی
یہ جو کچھ قطرے سے ہیں پلکوں پہ تھرّاتے ہوئے

شیخ شاید میں بھی کل ہو جاؤں تجھ سا پاکباز
دیر کچھ لگتی نہیں نیّت بگڑ جاتے ہوئے

لے ہی آئیں عشق کی ناکامیاں دل پر وہ وقت
جب نظر ڈرتی ہے تا حدِ نظر جاتے ہوئے

کر رہا ہوں موت بھی تیری نگاہوں سے قبول
اور دل میں زندگی ہی زندگی پاتے ہوئے
یادگارِ زندگیِ عشق ہی کیا چند داغ
ہاں مگر فردوس کے پھولوں کو شرماتے ہوئے
ایک کیفِ مشترک لڑتی ہوئی نظروں میں ہے
رند جیسے مے پئیں پیالوں کو کھنکاتے ہوئے
کیا کہوں کس طرح آنکھوں ہی میں پی جاتا ہوں اشک
پھول دیکھا ہے کبھی ڈالی پہ کمہلاتے ہوئے
عشق کی راہوں میں ہیں یوں رسم دنیا کے اسیر
ہر قدم پر اپنے سایہ تک سے گھبراتے ہوئے
نالہ زارِ زیست سے مانا مفر ممکن نہیں
یہ تو ممکن ہے کہ نالے کیجئے گاتے ہوئے
اک سلام اک مسکراہٹ، اک سوال اک شکریہ
وہ بھی یونہیں راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے
ہم نے بھی ملّا کو سمجھانے کو سمجھایا مگر
چوٹ سی لگتی ہے دل میں اس کو سمجھاتے ہوئے

اپریل ۱۹۴۳ء

(۵)

برکھا رُت ہے ابر ہے پیارے   آ اب دوری جبر ہے پیارے

جی تو بس میں آ بھی جائے   عمر بڑی بے صبر ہے پیارے

تجھ سے دور یہ حال ہے جی کا   سانس بھی لینا جبر ہے پیارے

دن ہے ایک بھیانک سپنا   رات اندھیری قبر ہے پیارے

آس کا تارا چھپ چھپ جائے   چھایا ایسا ابر ہے پیارے

ہجر کے ماروں کا جینا کیا   دھیان ترا اور صبر ہے پیارے

تجھ بن جی ہے سُونا سُونا   جی ہے یا اک قبر ہے پیارے

کھُل کھُل کے گھِر گھِر کے برسے   آنکھ نہیں اک ابر ہے پیارے

ریت یہ کیسی ہے اس جگ کی   اپنوں ہی پر جبر ہے پیارے

مجبوروں کا قابو ہی کیا   عشق کی قسمت صبر ہے پیارے

ملّا کی ڈاڑھی پہ نہ جاؤ
ملّا دل کا گبر ہے پیارے

جولائی ۱۹۴۳ء

(۶)

دنیا کے وہی قصے ہیں مگر عنوان بدلتے جاتے ہیں
فطرت قائم ہے اپنی جگہ انسان بدلتے جاتے ہیں

ایمان بدلتی دنیا میں ہر آن بدلتے جاتے ہیں
ہاں سینہ بہ سینہ آنے میں قرآن بدلتے جاتے ہیں

مابینِ خداوند و آدم اک جنگ چھڑی تھی روزِ ازل
وہ جنگ ابھی تک جاری ہے میدان بدلتے جاتے ہیں

فطرت کے تقاضوں پر پہرے ہیں آج بھی رسم و ایماں کے
قیدی کے فقط بہلانے کو دربان بدلتے جاتے ہیں

شرڈھا کے اندھیرے گھاٹ پہ بھی اب بھگتوں کی بھگتی وہ نہیں
ٹھاکر جی سنبھالو ٹھکرائی ججمان بدلتے جاتے ہیں

ہستی کا سفر ہے طولانی اس میں یکسانی نادانی
جو شاہ سوارِ ماہر ہیں وہ ران بدلتے جاتے ہیں

ہر دور پیمبر لاتا ہے ہر سانس سندیسہ دیتی ہے
جیسا جیسا وقت آتا ہے اعلان بدلتے جاتے ہیں

۲۴۳

نیکی و بدی کے خانوں کی ہر روز لکیریں مٹتی ہیں
زندہ دنیا کی نظروں کے میزان بدلتے جاتے ہیں
ملّا کو وفا سے بیگانہ کہنا ہے پیارے بھول تری
ہے سلطنتِ دل اس کی وہی سلطان بدلتے جاتے ہیں

نومبر ۱۹۴۳ء

ٹھنڈی کافی

(۱)

اس میں خوبی سی کچھ آئینِ مکافات کی تھی
کچھ جنوں خیز بغاوت سی بھی جذبات کی تھی
اک فسوں ساز شرارت سی بھی کچھ رات کی تھی
ورنہ اس کو نہ مجھی کو خبر اس بات کی تھی
کہ یہی رات مقدّر میں ملاقات کی تھی

(۲)

نہ کوئی عہد ہوا تھا نہ چلی تھی تدبیر
کسی کوشش کا نتیجہ نہ مآلِ تدبیر
اتفاقات کی کڑیوں سے بنی تھی زنجیر
آئی بننے پہ تو بنتی ہی گئی پھر تقدیر
منتظر جیسے مری زیست اسی رات کی تھی

(۳)

گرمیاں ختم پہ تھیں آمدِ باراں کی تھی آس
ہلکے چھینٹوں سے بجھی تھی نہ ابھی خاک کی پیاس
دھان کی کنواریاں استادہ تھیں کھیتوں میں اُداس
دل سے دہقاں کے مِٹا تھا نہ ابھی خوف و ہراس
رُت ابھی ایک نہ برسی ہوئی برسات کی تھی

(۴)

میرے اک دوست اُسی رات تھے سرگرمِ سفر
اُن کی ٹرین آئی بڑی دیر سے اسٹیشن پر
کرکے رخصت انھیں آخر میں جب آیا باہر
پاس زینوں کے یکایک مجھے آئی وہ نظر
اور کچھ فکر سی چہرے پہ کسی بات کی تھی

(۵)

ایک مدت سے میں تھا اس کی محبت میں اسیر
میں سمجھتا تھا کہ ہوں اس کی نگاہوں میں حقیر

میری ہمّت ہی نہیں تھی کوئی سوچوں تدبیر
بازیِ دل کی نگاہوں میں یہی تھی تصویر
چاہے جو چال چلوں میرے لئے مات کی تھی

(۶)

دور ہوتی ہی چلی جاتی تھی دُنیائے خیال
اب نہ خط تھا نہ پیام اور نہ کبھی پرسشِ حال
کہیں ملتے بھی اگر تھے تو وہ غیروں کی مثال
اک سلام ایک تبسّم کوئی رسمی سا سوال
کچھ زمانے سے یہی طرزِ ملاقات کی تھی

(۷)

پہلے دم بھر کے لئے ایک ذرا میں جھجکا
ہو نہ ہو اس کو گوارا مرا ملنا اس جا
پھر ذرا جی کو کڑا کر کے میں اس سمت بڑھا
سامنے جا کے نمسکار کیا اور پوچھا
کوئی خدمت مرے لائق مری اوقات کی تھی

(۸)

دیکھ کر مجھ کو وہ اک بار ہوئی حیراں سی
رُخ پہ پھر ایک تبسّم کی کرن دوڑ گئی
اک کرن جو نہیں معلوم کہاں سے پھوٹی
آج تک جس کی حقیقت کبھی مجھ پر نہ کھُلی
اس کی آنکھوں کی کہ ہونٹوں کے مضافات کی تھی

(۹)

پھر لگی کہنے کہ اس وقت بہت خوب ملے
جانے کے سال اسی آس میں بیٹھے بیتے
شاید آجائے سواری کوئی بھولے بھٹکے
یہ غنیمت تھی کہ جینے کے لئے ساتھ مرے
ایک تھرماس اور اک جلد حکایات کی تھی

(۱۰)

میں نے بھی ہنس کے کہا تم کو ملی خوب سزا
اپنے آنے کا نہ دو اور کوئی مجھ کو پتا

آج اک کارِ خرد عمرِ حماقت میں کیا
گھر پلٹنے کے لئے روک لیا ہے تانگا
مصلحت اس میں یہی تاضیِ حاجات کی تھی

(۱۱)

پھر یہ پوچھا کہ کہاں رات کی ہے جائے قیام
بولی، ہوٹل میں ہے بُک پہلے سے کمرہ مرے نام
میں نے چاہا تھا کروں نیند کسی کی نہ حرام
نیک ارادوں کا مگر حیف یہی ہے انجام
اور پھر لب پہ وہی موجِ خرابات کی تھی

(۱۲)

راہ لی بولتے ہنستے یوں ہی پھر ہوٹل کی
سرد مہری کوئی جیسے کبھی آپس میں نہ تھی
دل میں لیکن یہی شک سا کہ یہ سب ہے وقتی
جیسے دو دائرے اک نقطہ پہ مل جائیں کبھی
حد الگ پاس پہونچ کر بھی خیالات کی تھی

(۱۳)

چھوٹ جائے سپرِ صبر و توازن نہ کہیں
ڈھ پڑے کھوکھلی بنیادِ تمدن نہ کہیں
کھول لیں دل کی گرہ شوق کے ناخن نہ کہیں
خالقِ عشق کے لب بول اٹھیں پھر کُن نہ کہیں
سعی پیہم سی نگہداریِ جذبات کی تھی

(۱۴)

جنگ کا رنگ حکومت کی درندہ صفتی
بھاؤ غلّہ کا ہر اک شے کی گرانی تنگی
کوئی تقریب، نئی فلم، سفر کی سختی
گفتگو ایک وہ بے ربط مسلسل سطحی
دل کی آواز نہ ابھرے فقط اس بات کی تھی

(۱۵)

رات تاریک تھی جیسے کسی اندھے کی نگاہ
اِکّے دُکّے کسی رہرو کی جھلک گاہ بہ گاہ

چند لمحات کو لیٹی تھی وہ وردیہ سرِ راہ
اپنی پیدائشی وردی میں غریبوں کی سپاہ
ساعتِ امن یہ مابینِ مصافات کی تھی

(۱۶)

بند بازار تھے سڑکوں پہ تھی بجلی کی قطار
تھک کے سوئی تھی دُلہن شہر کی پہنے ہوئے ہار
دھندلے دھندلے سے مکانات کہ سینہ کا اُبھار
ہلکی ہلکی سی ہوا سانس کی جیسے رفتار
عصمتِ شہر پہ چادر سی بڑی رات کی تھی

(۱۷)

شبِ تاریک میں ہوٹل نظر آیا ایسے
ابر کی گود میں اک ابرِ سیہ تر جیسے
کنجی لی ہال میں لٹکے ہوئے اک نقشے سے
پہونچے اسباب لیے کمرے میں جیسے تیسے
داستاں ختم بالآخرِ غمِ آفات کی تھی

(۱۸)

میں نے یہ کہہ کے کہ نا وقت ہے رخصت مانگی
بولی ٹھہرو ابھی جاتے ہو کہاں بیٹھو بھی
میرے تھرماس میں تھوڑی سی ہے ٹھنڈی کافی
آؤ پی لو مری خاطر سے سہی اک پیالی
ہر ادا صبر شکن اس کی مدارات کی تھی

(۱۹)

کافی پینے لگے پھر بیٹھ کے اک صوفے پر
خود بخود ہونے لگیں باتیں بہ عنوانِ دگر
اب جو ملتی تھی تو رک جاتی تھی دم بھر کو نظر
دل پہ ماحول کا کچھ غیر شعوری سا اثر
ایک وارفتگی ساون کی سیہ رات کی تھی

(۲۰)

زیبِ دیوار تھی اک شوخ حسینہ عریاں
جانے کیا اس کی نگاہوں میں تھا جادو پنہاں

یک بیک دوڑ گئی جسم میں اک برقِ تپاں
خون کی ہر بوند میں پھر رقص کناں اک طوفاں
دل میں اک گونج سی بھولے ہوئے نغمات کی تھی

(۲۱)

وقت کی بات تھی یا سوزِ جگر کی تاثیر
وہ بھی کرنے لگی کچھ کھوئی ہوئی سی تقریر
کھنچ گئی جیسے یکایک کوئی سینوں میں لکیر
گو ابھی لب پہ نہ تھی جذبۂ دل کی تعبیر
ایک دنیا مگر آنکھوں میں اشارات کی تھی

(۲۲)

جو نہ کھلتی تھیں وہ کھلنے لگیں راہیں از خود
گر پڑیں فرقِ تکدّر سے کلاہیں از خود
دل کی دل سے لیے اٹھنے لگیں بانہیں از خود
ڈھونڈنے آئیں نگاہوں کو نگاہیں از خود
لب بہ ہر مُو پہ صدا دل کی مناجات کی تھی

(۲۳)

ہوگئی دونوں پہ پھر ایک خموشی طاری

اب وہ باتوں میں روانی تھی نہ شوخی نہ ہنسی

جیسے لوہے کی سلاخوں میں گھرے دو قیدی

دور ہی دور سے کچھ آنکھوں میں کہہ لیں۔ وہ گھڑی

پا بہ زنجیر اسیروں کی ملاقات کی تھی

(۲۴)

میں جواں سال نہیں تھا کوئی معصوم نہ تھا

پھر بھی اس راز سے واقفِ دلِ مغموم نہ تھا

اس کی در پردہ توجہ سے میں محروم نہ تھا

ایک دھوکا تھا تغافل مجھے معلوم نہ تھا

ہائے وہ رات بھی کیا کشف و کرامات کی تھی

(۲۵)

میری خودداریِ خاموش کا اُس کو تھا گِلا

اُس کی بیگانہ وشی کا تھا مجھے بھی شکوا

در حقیقت نہ یہی کچھ تھا نہ وہ ہی کچھ تھا
سمجھے بیٹھے تھے جسے غیریتِ دل کی فضا
ایک بدلی سی محبت کے حجابات کی تھی

(۲۶)

وہ تو ہاں تھی ہی مری خلوتِ دل کی قندیل
مجھ سا ناچیز بھی تھا اُس کی نگاہوں میں جمیل
شوق بیتاب کہ ہو جذبۂ دل کی تکمیل
بیچ میں صرف وہ ڈٹی ہوئی گرتی سی فصیل
ایک مٹتی ہوئی دنیا کی روایات کی تھی

(۲۷)

نگہِ گرم تمنّا کی وہ شعلہ اثری
اک سلگتا ہوا پارہ تھا کہ خونِ جگری
اک لرزتے ہوئے آنچل کی وہ زیر و زبری
شرم کی آخری مفلوج سی سینہ سپری
مشتعل آگ سی بھڑکے ہوئے جذبات کی تھی

(۲۸)

ٹوٹے بوسیدہ تمدّن کے کگارے آخر
رہ گئے طاق پہ دنیا کے اجارے آخر
قدِ آدم اُٹھے سینوں کے شرارے آخر
ایک آواز ہیں دو جسم پکارے آخر
گفتگو حسن و محبت میں مساوات کی تھی

(۲۹)

پہلے روح و تن کے کدورت کی صفائی کا وہ وقت
لب سے اور چشم سے پھر عقدہ کشائی کا وہ وقت
دل کی بڑھتی ہوئی گستاخ ڈھٹائی کا وہ وقت
رفتہ رفتہ بشریّت کی خدائی کا وہ وقت
حکمرانی کی گھڑی عشقِ خوش اوقات کی تھی

(۳۰)

توڑ کر قفلِ نہاں خانۂ زندانِ حیات
آرزو لے ہی اُڑی چند سنہرے لمحات

چھان کر دہر کا تلخابۂ زہر آیات
پھر جواں عزم محبت نے پیا جامِ نبات
مے جو تھی دور میں وہ چشمۂ ظلمات کی تھی

(۳۱)

عظمتِ فطرتِ انساں کا لگا کر نعرا
فاتحِ عشق نے مستانہ پھر اک رقص کیا
پھر فرشتوں نے حسد سے سوئے دنیا دیکھا
خلد نے خلد کے باغی کو کیا پھر سجدا
عرش پر بات پھر آدم کی فتوحات کی تھی

(۳۲)

روزنِ نور کھلا غم کے سیہ خانوں میں
شعلۂ برق گرا خاک کے پیمانوں میں
جسم کی شمع جلی عقل کے ویرانوں میں
بانسری پھر بجی ایماں کے بیابانوں میں
رات پھر ساحلِ جمنا کی حکایات کی تھی

(۳۳)

پاسبانِ چمن دہر سے شاید ہوئی بھول
غم کی کیاری میں اُگا ایک مسرت کا بھی پھول
عشق نے جھونک دی پھر چشمِ روایات میں دھول
کرّۂ خاک پہ کچھ دیر تھا جنّت کا نزول
رات جیسے کسی دنیائے طلسمات کی تھی

(۳۴)

اپنے معراجِ ترنّم پہ تھا سازِ فطرت
ایک نغمہ تھا تکلّم تو خموشی اک گت
چشم ولب کوثر و تسنیم تو بازو جنّت
سادہ سی سادہ ہر اک بات میں بھی اُس ساعت
ایک رنگینیٔ پُر کیف محاکات کی تھی

(۳۵)

قصّۂ دہر کے ہر بابِ فغاں کے باوصف
پا بہ زنجیریٔ عمرِ گزراں کے باوصف

دیوتاؤں کی نگاہِ نگراں کے باوصف
نہ مٹی بندہ نصیبیِ جہاں کے باوصف
کون خلّاق لکیر ایسی مرے ہات کی تھی

(۳۶)

مجھ کو اس فکر کی دنیا میں صداقت کی قسم
آدم پاک کے سینے کی امانت کی قسم
خوں کے ہر قطرۂ باغی کی نبوّت کی قسم
ایک اُجڑے ہوئے فردوس کی حسرت کی قسم
زیست تھی زیست کے شایاں تو اسی رات کی تھی

(۳۷)

اس میں خوبی سی کچھ آئینِ مکافات کی تھی
کچھ جنوں خیز بغاوت سی بھی جذبات کی تھی
اک فسوں ساز شرارت سی بھی کچھ رات کی تھی
ورنہ اس کو نہ مجھی کو خبر اس بات کی تھی
کب یہی رات مقدّر میں ملاقات کی تھی

اگست ۱۹۴۳ء

قحطِ کلکتہ

(۱)

ارضِ بنگال کا نازوں کا وہ پالا ہوا شہر
شاہِ خاور کی شعاعوں کا اُجالا ہوا شہر
چشمۂ مشک و گل و عود میں ڈالا ہوا شہر
روضۂ خلد کے سانچے میں وہ ڈھالا ہوا شہر

آج سنسان اسی شہر کی ہر بستی ہے
عرصۂ جنگ سے بھی موت وہاں سستی ہے

(۲)

جنگ کی موت تو ہے طالعِ بیدار کی موت
ننگِ قومی کے لئے قوم کے جرّار کی موت
سرفروشی کی اجل غیرت و ایثار کی موت
کسی مقصد کے لئے مردِ وفادار کی موت

نوعِ انساں کی روایات ہیں زندہ جس سے
روئے تاریخ پہ ہے سرخیِ غازہ جس سے

(۳)

جنگ کی موت میں اک حُسنِ مکافات تو ہے ۔۔۔ ایک یکسانیتِ صدمہ و آفات تو ہے
جھونپڑی میں جو ہے محلوں میں وہی رات تو ہے ۔۔۔ غم کی تقسیم میں اک رنگِ مساوات تو ہے
اس میں کچھ تفرقۂ مفلس و زردار نہیں
ایک گولی کسی فرقہ کی طرفدار نہیں

(۴)

ہے مگر قہر یہ بے موت بلائی ہوئی موت ۔۔۔ ناتوانوں پہ توانا ؤں کی لائی ہوئی موت
نشینوں سے زمینوں پہ گرائی ہوئی موت ۔۔۔ چور بازار کے سکّوں کی چلائی ہوئی موت
قتل کر دے کسی بیکس کو ہلاکو جیسے
لُوٹ لے خانۂ بیوہ کوئی ڈاکو جیسے

(۵)

ج بنگال میں جاری ہے یہ فرمانِ اجل ۔۔۔ گوشہ گوشہ میں ہے اک گورِ غریبانِ اجل
لہ غم کا ہے اور راہ بیابانِ اجل ۔۔۔ فاقہ مستی کا فسانہ ہے بہ عنوانِ اجل
تیرہ بختی کی ہر اک سمت جہانداری ہے
سپہ یاس ہے اور بھوک کی سالاری ہے

(۶)

منھ سے نکلی ہوئی وہ سرخ زباں خون سے تر ۔ کالے جوشن وہ سنپولوں کے سیہ بازو پر
پہنے گوندھے ہوئے اک ہار میں کچھ کاسۂ سر ۔ کھڑگ اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں خوں کا ساغر
رقص کرتی ہوئی لاشوں پہ بھوانی آئی
آج پھر جوش پہ کالی کی جوانی آئی

(۷)

آج گندم کی بہا عرش کے خوشوں سے سوا ۔ تاج شاہی کے چمکتے ہوئے ہیروں سے سوا
حرفِ قرآں سے سوا وید کے شبدوں سے سوا ۔ ماں کی نظروں میں بھری گود کے پھولوں سے سوا
خواہشِ اوّلِ انساں کے مقابل سب ہیچ
عقل و دیں ہیچ، نزاعِ حق و باطل سب ہیچ

(۸)

خاکِ بنگال میں اب بھی ہے وہی ہریالی ۔ اب بھی گھر گھر کے برستی ہیں گھٹائیں کالی
کیا قیامت ہے وہی جس نے یہ کھیتی پالی ۔ اس کے حصہ میں نہیں ایک بھی سوکھی بالی
وہ حکومت کی ضرورت کہ ٹھکانہ ہی نہیں
اور بےچارے کساں کیلئے دانہ بھی نہیں

(۹)

حاجتِ فوجِ مسلّم نگرِ انداز کے ساتھ
جنگ برحق مگر آئینِ جہاں ساز کے ساتھ

نغمۂ فتح تو ہے خلق کی آواز کے ساتھ
نہ کہ اُکھڑے ہوئے انفاس کی پرواز کے ساتھ

جیت دھوکا ہے اگر جیت کی صورت ہے یہی
تین حرف اس پہ اگر فتح کی قیمت ہے یہی

ستمبر ۱۹۴۳ء

سنہ ۱۹۳۴ء

غزلیات

(۱)

صفِ حیات سے جب کوئی تشنہ کام آیا
نظامِ ساقیِ محفل پہ اتّہام آیا

ملا بھی غم تو وہ غم زندگی کے کام آیا
مرے لئے ہر اک آنسو میں ایک جام آیا

لبِ کلیم پہ آیا نہ پھر سوال کوئی
ہزار برقِ پشیماں کا پھر پیام آیا

عدو کو بخش دیے ہم نے کوثر و تسنیم
یہ کس کے ہونٹوں کو چھو کر ہمارا جام آیا

کھڑا ہوں دیر سے گم زیست کے دوراہے پر
جو کارواں سے چھڑاتا ہے وہ مقام آیا

کوئی مصوّرِ ہستی کا شاہکار بھی ہے
ابھی تلک تو ہر اک نقش ناتمام آیا

حریف بن کے جہاں جب مٹا سکا نہ ہمیں
تو دوست بن کے محبت کا لے کے نام آیا

مجھے مٹا کے وہ تھوڑی ہی دیر خوش سے رہے
پھر اس کے بعد محبت کا انتقام آیا

خوشا وہ ساعتِ فردوس جبکہ پہلے پہل
کسی کے لب پہ ذرا رک کے اپنا نام آیا

رہِ حیات ہے سُونی مقامِ عشق کے بعد
یہاں تلک تو ہر اک دل سبک خرام آیا

ہنسوں کہ روؤں میں اپنی حیات پر مُلّا
ہوا سے بچ کے سحر تک چراغِ شام آیا

جنوری ۱۹۴۴ء

(۲)

دل کو خلشِ شوق سے بیگانہ بنا دے — اُلفت کو فقط روح کا نذرانہ بنا دے

وارفتگیِ شوق پہ پابندیِ صد ہوش — یہ عقل نہ اک دن تجھے دیوانہ بنا دے

اے دل یہ ترے ضبط کا دعویٰ ہی ابھی خام — یوں اپنی خموشی کو نہ افسانہ بنا دے

تو اپنی کڑی جوڑ دے رودادِ جہاں میں — اور یوں کہ اُسے حاصلِ افسانہ بنا دے

بسنے کا نہیں حشر تلک وہ دلِ برباد — آباد جسے کر کے وہ ویرانہ بنا دے

مے تجھ کو ملے گی ترے حصّہ کی یقیناً — یوں جی کہ ہر اک سانس کو پیمانہ بنا دے

افسانۂ دنیا کو بنا دل کی حقیقت — پھر دل کی حقیقت کو اک افسانہ بنا دے

مُلاّ ترے دل میں نہیں وہ تکملۂ سوز
جو شمع کو تیری ترا پروانہ بنا دے

اپریل ۱۹۴۷ء

(۳)

رازِ ہستی تشنۂ تعبیر ہے تیرے بغیر
زندگی تقصیر ہی تقصیر ہے تیرے بغیر

زیست کی ہر کامیابی بھی مری نظروں میں خاک
ایک بے بنیاد سی تعمیر ہے تیرے بغیر

جس کو ہونا چاہیے تھا تازہ دم کلیوں کا ہار
وہ نفس کا سلسلہ زنجیر ہے تیرے بغیر

ہاں وہی لب جو تبسم کا خزانہ تھا کبھی
آج رہینِ نالۂ شبگیر ہے تیرے بغیر

دل کی حالت ہے کہ جیسے اک طلسمِ بے کلید
ہر تمنا حرفِ بے تعبیر ہے تیرے بغیر

ہو نہیں پاتی کوئی آسان سی مشکل بھی سہل
کُند سا ہر ناخنِ تدبیر ہے تیرے بغیر

چاند برساتا ہے جب راتوں کو امرت کی پھوار
ہاں اسی کی ہر لڑی اک تیر ہے تیرے بغیر

روشنی اس کے کسی رُخ پر بھی آ پاتی نہیں
زندگی دُھندلی سی اک تصویر ہے تیرے بغیر

آ اگر بیگانۂ احساس تیرا دل نہیں
تیرا مُلّا خستہ و دلگیر ہے تیرے بغیر

اپریل ۱۹۴۴ء

(۴)

صبح ہے بے نور، سونی شام ہے تیرے بغیر
آ کہ حرفِ زیست اک دشنام ہے تیرے بغیر

جی رہا ہوں اور جینے میں کوئی لذّت نہیں
زندگی اک مفت کا الزام ہے تیرے بغیر

ہر نفس اک جہد ہے جس کا کوئی حاصل نہیں
آرزو آغازِ بے انجام ہے تیرے بغیر

پڑ رہے ہیں بے ارادہ بہکے بہکے سے قدم
زندگی اک لغزشِ ہر گام ہے تیرے بغیر

یہ اجازت بھی نہیں چھپ کر کہیں کاٹیں حیات
جانے کیا دنیا کو ہم سے کام ہے تیرے بغیر

شعلہ زارِ شوق بن سکتا تھا جو دورِ حیات
وہ بھی اک خاکسترِ ایّام ہے تیرے بغیر

ہاں جلا دے آکے پھر اس کی حقیقت کا چراغ
جانِ ملا گشتۂ اوہام ہے تیرے بغیر

جون ۱۹۴۴ء

(۵)

زندگی سلسلۂ کرب و بلا ہے تو سہی
مگر اس کرب میں بھی ایک مزا ہے تو سہی

افقِ دل پہ نئی کوئی گھٹا ہے تو سہی
پھر فروزاں نم سی نگاہوں کی فضا ہے تو سہی

نزدِ ساقی نہ سہی دور سہی ساقی سے
آخر اس بزم میں میری کوئی جا ہے تو سہی

اب یہ تقدیر مری مجھ کو ملا زہرِ فنا
انھیں آنکھوں میں مگر آبِ بقا ہے تو سہی

نامِ اُلفت سے اگر چڑھ ہے تو کہہ لو کچھ اور
کوئی شے عقل سے عظمت میں سوا ہے تو سہی

آ گئی ہے اُسے شاید کسی فردوس میں نیند
ورنہ دنیا کے غریبوں کا خدا ہے تو سہی

شک سا ہوتا ہے مجھے تو نے پکارا تھا کبھی
ایک بھولی ہوئی کانوں میں صدا ہے تو سہی

غمِ ہستی کے لئے یہ بھی مداوا نہ ہوئی
مے تری چشم کی اندوہ رُبا ہے تو سہی

میری غیرت نے کبھی تم سے تقاضا نہ کیا
ورنہ دنیا میں محبت کا صلا ہے تو سہی

ٹوٹتا ہے کہ نہیں اب درِ زنداں اپنا
آج کچھ تند زمانہ کی ہوا ہے تو سہی

کھولنے ہم بھی چلے تھے گرہِ دل اپنی
ایک اُلجھا ہوا ہاتھوں میں سرا ہے تو سہی

عشق کی شانِ وفا کا یہ تقاضا ہے کہ ہنس
اُس کی پرسش پہ خموشی بھی گلا ہے تو سہی

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ ملّاہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

جولائی ۱۹۴۳ء

(٦)

کچھ بھی جفائے دوست ہو سامنے جا کے بھول جا
دل میں گلے ہزار ہوں آنکھ ملا کے بھول جا

شانِ دعا تو ہے یہی حرفِ سوال کچھ نہ ہو
ہاتھ اُٹھے تھے کس لئے ہاتھ اُٹھا کے بھول جا

دیر و حرم سے دور ہے محویتِ نیازِ عشق
کوئی بھی در ہو تجھ کو کیا سر کو جھکا کے بھول جا

کانوں کو اس کے ناگوار جب ترے نغمہائے شوق
خلوتِ شامِ ہجر میں دل کو سُنا کے بھول جا

میری نگاہِ شوق ہی پردہ دری کرے تو کیوں
تو بھی کبھی تو حُسن خود پردہ اٹھا کے بھول جا

دیکھ وفائے عشق کا ایک یہی اصول ہے
لمحے کرم کے یاد رکھ سال جفا کے بھول جا

تیز روئ زیست میں فرصتِ عاشقی کہاں
طاق سے لے جو راہ میں شمع جلا کے بھول جا

دل پہ نہ لے جو ہو سکے تلخیِ غم کا کچھ اثر
ہنس کے بھلا سکے نہ جب اشک بہا کے بھول جا

عقل و خرد بجا مگر دل کا بھی حق ہے زیست پہ
کوئی گھڑی تو بارِ ہوش سر سے گرا کے بھول جا

ہار کے جانؔ دل بھی کر ملتا نہ اس سے کچھ گِلا
ایک جُوا ہے عشق بھی داؤں لگا کے بھول جا

اگست ۱۹۴۴ء

(۷)

جہاں کو ابھی تابِ الفت نہیں ہے — بشر میں ابھی آدمیت نہیں ہے

تکلف اگر ہے حقیقت نہیں ہے — تصنّع زبانِ محبت نہیں ہے

ضروری ہو جس کے لئے ایک دوزخ — وہ میرے تصور کی جنت نہیں ہے

مرے دل میں اک تو ہی تجھ سے حسیں تر — مجھے اب تری کچھ ضرورت نہیں ہے

محبت یقیناً خلافِ خرد ہے — مگر عقل ہی اک حقیقت نہیں ہے

اسے ایک بیتابیِ شوق سمجھو — تغافل کا شکوہ شکایت نہیں ہے

مجھے کر کے چپ کوئی کہتا ہے ہنس کر — انھیں بات کرنے کی عادت نہیں ہے

کبھی ہو سکے گا نہ مُلّا کا ایماں
جس ایماں میں دل کی نبوت نہیں ہے

نومبر ۱۹۴۴ء

(۸)

ہاں جفا پر بھی تری دل مرا بے آس نہیں — اپنی حد پر ہے محبت تو کبھی یاس نہیں

زندگی کیا جو دل اک جنّتِ احساس نہیں — پھر تو یہ زیست بجز رشتۂ انفاس نہیں

اس کمی کی کوئی دنیا میں تلافی ہی نہیں — تم نہیں پاس تو پھر کچھ بھی مرے پاس نہیں

یہ تو ممکن نہیں وہ جان کے ڈھائے یہ ستم — میری تکلیف کا شاید اسے احساس نہیں

کر لیا جس کو ترے غم نے شناسا اپنا — کوئی دنیا کی مسرت پھر اسے راس نہیں

غلط انداز نگاہوں سے نہ ہوگی تسکین — یوں پلانے سے تو بجھنے کی مری پیاس نہیں

شیخ سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی عظمتِ عشق — اس کے ادراک کا حاصل مرا احساس نہیں

دہر کی رسم محبت کو کہوں کچھ میں کون؟ — شاید اپنی ہی خطا ہو جو مجھے راس نہیں

اب سمجھنے سا لگا ہے تجھے کچھ کچھ ملاؔ
یہی بیگانہ روی ہے تو اسے یاس نہیں

دسمبر ۱۹۴۲ء

رخصت اے دوست

رخصت اے دوست !

یہی مرضی ہے تو اچھا میں چلا جاؤں گا
اب فسانہ غمِ اُلفت کا نہ دُہراؤں گا
غیرتِ عشق کو شکووں سے نہ ٹھراؤں گا
چُپ دبے پاؤں تری بزم سے اُٹھ آؤں گا
ہو سکے گا تو تجھے رُخ بھی نہ دکھلاؤں گا

رخصت اے دوست

تجھ کو آزردہ نہ کر دے یہ رُخِ زرد کہیں
تیری شمعوں کو بجھا دے نہ دمِ سرد کہیں
چھین لے تیری مسرت نہ مرا درد کہیں
تیرے پھولوں پہ نہ پڑ جائے مری گرد کہیں
تیرے سایہ سے بھی کترا کے نکل جاؤں گا

رخصت اے دوست

غم کی تلخی سے بھی ارماں کی حلاوت سے بھی دُور
نگہِ یاس کی خاموش شکایت سے بھی دُور
اپنی خود رحمی سے غیروں کی شماتت سے بھی دور
عشق کے خواب سے دنیا کی حقیقت سے بھی دُور
تجھ سے میں دُور بہت دُور چلا جاؤں گا

رخصت اے دوست

منحرف ہو کے تمنّا کی بہاروں سے بھی ہاں — پھیر کر آنکھ خود اپنے ہی ستاروں سے بھی ہاں
ہٹ کے سب ساتھ کے کھیلے ہوئے یاروں سے بھی ہاں — ہٹ کے اوجھل تری نظروں کے کناروں سے بھی ہاں

تیری دنیا کی حدوں سے بھی نکل جاؤں گا

رخصت اے دوست

اب نہ الجھیں گی تری راہوں سے راہیں میری — تجھ کو آزردہ کریں گی نہ نگاہیں میری
خلل اندازِ طرب ہوں گی نہ آہیں میری — اب ترے خواب بھی دیکھیں گی نہ بانہیں میری

مجھ کو ڈھونڈے گا بھی اب تُو تو میں چھپ جاؤں گا

رخصت اے دوست

اپریل ۱۹۴۴ء

دو یاتری

(ایک شادی کے موقع پر)

دو یاتری ساتھ چلے جیون مندر کا پھر درشن کرنے
پھر پریم کی مورت کے آگے دو من کے کنول روشن کرنے
نظروں سے ملا کر پھر نظریں، پھر ڈال کے بانھوں میں بانہیں
ہنستے ہنستے طے کرنے چلے جگ کی سیدھی الٹی راہیں
نیّا پہ دھنش کی بیٹھ کے پھر تاروں کے تیتھر پر گٹ دھرتے
سنسار کی کالی رین اپنے من سپنوں سے جگمگ کرتے
پھولوں کی طرح ہنستے گاتے آشا کی لچکتی ڈاروں پر
ارماں کے سنہرے کنجوں میں برکھا کے رو پہلے تاروں پر
اے کاش یونہیں ملا ان کو رہتی دنیا تک نیند آئے
کھل جائیں نہ ان کی بند آنکھیں سپنا سپنا ہی رہ جائے

سونلائیں نہ کالے تپتے دن ان کی یہ چمکتی تصویریں
کھلتی ہوئی کلیوں کے گجرے بن جائیں یہ ریشمی زنجیریں
پڑجائیں نہ دل میں نیل ان کے دنیا کے سنہری دھوکوں سے
چھل جائیں نہ ان کے نرم بدن ہنستی نظروں کی نوکوں سے
کانٹوں سے بھرے بنجر نکلیں پھولوں کی گپھائیں ان کیلئے
دکھ کے ساگر، چنتا کے بھنور، امرت کی گھٹائیں ان کیلئے
سو جائیں نہ ان کے دل اس مندر کے منتر گاتے گاتے
دنیا ہی کے سے ہو جائیں نہ یہ دنیا سے رگڑا کھاتے

اپریل ۱۹۴۲ء

مَیں

مجھے ممکن ہے دھوکا ہو کہ میں روئے حقیقت ہوں
مگر جو کچھ بھی ہوں اس دورِ باطل میں غنیمت ہوں
مجھے روشن نہیں کرتی کوئی سیلی سی چنگاری
فروزاں ہوں تو اس آتش فشاں دل کی بدولت ہوں
مذاقِ بزم نے کیا کیا نہ زک دینے کی کوشش کی
ہواؤں سے جو لڑ لڑ کر بنی ہے وہ عمارت ہوں
میں اپنے وقت کا یہ تو زمانہ ہی بتائے گا
بہ قولِ خود اک آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
ازل سے آج تک گونجے ہیں جو دنیا کے کانوں میں
وہی آنکھوں کا نغمہ ہوں وہی دل کی حکایت ہوں
مرے نغموں سے ہے بیزار آج اک جنگجو دنیا
ابھی کانٹوں میں جو تلتا ہے وہ برگِ محبت ہوں

بنائے زندگی رکھتا ہوں فطرت کے تقاضوں پر
جو فخرِ آدم پہ کرتا ہے وہ جرمِ آدمیت ہوں
مری تقدیر ہے خود جل کے اوروں کو ضیا دینا
غم اپنے حق میں ہوں اوروں کا سامانِ مسرّت ہوں
بھٹک کر آگیا اس دور میں کیسے خدا جانے
خرد کی یخ زدہ صبحوں میں اک شامِ محبّت ہوں
خزاں کے تُند جھونکوں میں بھی خوابِ رنگ و بُو دیکھا
جہنّم میں بھی جس نے گُل کھلائے ہیں وہ جنّت ہوں
مجھی پر ایک دن ایمان لائے گا جہاں ملّا
اگر اُلفت خدائی ہے تو میں دل کی نبوّت ہوں

نومبر ۱۹۴۴ء

رُوٹھنا

اب نہ کہوں گا تجھ سے کچھ مجھ کو ملال کچھ بھی ہو
لب پہ نہ آئے گا سوال دل میں سوال کچھ بھی ہو
میری خوشی و رنج سے جب تجھے کچھ غرض نہیں
پُوچھ نہ مجھ سے میرا حال اب مرا حال کچھ بھی ہو

دسمبر ۱۹۴۴ء

اعترافِ محبّت

وہ اعترافِ محبّت کا لمحۂ فردوس
میں پا چکا زرِ دلبری کہو نہ کہو
نظر سے کہہ بھی چکے تم میں دل سے سُن بھی چکا
زباں سے اب یہ تمہاری خوشی کہو نہ کہو

دسمبر ۱۹۴۴ء

گُل کردو قمر کو

(۱)

اے کاش بجھادے کوئی قندیلِ قمر کو
اے ابر کے پارے
اس چاند کو ڈھک دے
کیا جانئے کب سے یہ مجھے گھور رہا ہے
پیڑوں کی گھنی ڈالوں میں گہ خود کو چھپا کر
گہ سامنے آکر
نظروں میں مری اپنی نگاہوں کو چبھو کر
گستاخ کہیں کا
بے شرم کی بھوے سے جھپکتی بھی نہیں آنکھ
اور اتنی بڑی آنکھ
جیسے کہ ہے اک گھاؤ سا سینے میں فلک کے

جس میں سے رواں ایک سنہری سا لہو ہے۔
اک گوشہ میں اس کے
میں کیا مری ہستی کی ہر اک چیز سما جائے
اور اس کی نظر کے وہ چمکتے ہوئے نیزے
سینہ میں اترتے ہی چلے جاتے ہیں میرے
گھنگھور اندھیرے بھی نہاں خانۂ دل کے
ان شوخ لٹیروں کی نظر سے نہیں محفوظ
یہ چیر کے ہر پردہ خاطر مجھے ڈر ہے
دیکھیں گے مری روح برہنہ کا تماشا
اور چھین کے لے جائیں گے مجھ سے مری دولت

وہ رازِ محبت

جی بھر کے جسے خود ابھی میں نے نہیں دیکھا
اور ان کی یہ آوارہ و بیباک نگاہیں
لے جائیں گی ہر گوشۂ دنیا میں مری شرم
کس طرح ملاؤں گی نظر اہلِ جہاں سے

ہو جاؤں گی رسوا
اے ابر کے پارے
آ میرے سہارے
اس چاند کو ڈھک دے

(۲)

شاید یہ فلک زاد
ہے فطرۃً آزاد
آئینِ رہ و رسم وہاں کا ہے مگر اور
اخلاقِ زمیں اور ہے تہذیبِ فلک اور
اُس دیس میں کیا عشق کوئی جرم نہیں ہے؟
کیا خواہشِ فطری کو چھپایا نہیں جاتا؟
کیا دل کے تقاضوں کو دبایا نہیں جاتا؟
میں بھی وہیں ہوتی تو مجھے فکر نہ ہوتی
لیکن مری دنیا
یہ خاک کی بستی

چھائے ہوئے ہر سمت جہاں عقل کے سایے
ایماں کے دھندلکے
بے نور فضائیں
آباد جہاں آدمِ اعظم کی وہ اولاد
جو مورثِ اول کے لئے باعثِ صد ننگ
ٹھٹھرے ہوئے انساں
کم ظرف، جفا کیش، غرض کوش، ریاکار
جو شب کو بھی سوتے ہیں تو پہنے ہوئے چہرے
ترسی ہوئی، سہمی ہوئی، کچلی ہوئی روحیں
ڈرتے ہوئے لیتی ہیں جو اوروں سے چھپا کر
جکڑے ہوئے سینوں میں کچھ اکھڑی ہوئی سانسیں
ہر سانس میں سسکی
اور شوق سے ڈالے ہوئے خود اپنے گلے میں
صدیوں کی تراشی ہوئی زنجیرِ گرانبار
ہر دور میں جس میں

بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں کچھ حلقۂ نو اور

اک نسلِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام آہ!

پیدائشی قیدی

ان آہنی کڑیوں سے رہائی نہیں ممکن

مجھ میں نہیں ہمت

طائر میں کہاں دم کہ قفس توڑ کے اُڑ جائے

اس چاند سے کہہ دو کہ نہ پھیلائے بغاوت

بہکائے نہ مجھ کو

اس کی جو سنوں گی تو کہیں کی نہ رہوں گی

دنیا کو ابھی اس کی تجلّی کی نہیں تاب

ظلمت کی حکومت ہے اندھیرے کا یہاں راج

اے ابر کے پارے

لا اپنی سیاہی

اور چاند پہ مل دے

دسمبر ۱۹۴۴ء

۱۹۴۵ء

غزلیات

(۱)

آرزو کو دل ہی دل میں گھٹ کے رہنا آگیا
اور وہ یہ سمجھے کہ مجھ کو رنج سہنا آگیا

پوچھتا کوئی نہیں اب مجھ سے میرا حالِ دل
شاید اپنا حالِ دل اب مجھ کو کہنا آگیا

سب کی سنتا جا رہا ہوں اور کچھ کہتا نہیں
وہ زباں ہوں لب جسے دانتوں میں رہنا آگیا

زندگی سے کیا لڑیں جب کوئی بھی اپنا نہیں
ہو کے شل دھارے کے رُخ پر ہم کو بہنا آگیا

لاکھ پردے اضطرابِ شوق پر ڈالے مگر
پھر وہ اک مچلا ہوا آنسو بہ بہنا آگیا

تجھ کو اپنا ہی لیا آخر نگارِ عشق نے
اے عروسِ چشم لے موتی کا گہنا آگیا

پی کے آنسو سی کے لب بیٹھا ہوں یوں اس بزم میں
درحقیقت جیسے مجھ کو رنج سہنا آگیا

ایک ناشکرے چمن کو رنگ و بو دیتا رہا
آگیا ہاں آگیا کانٹوں میں رہنا آگیا

لب پہ نغمہ اور رُخ پر اک تبسم کی نقاب
اپنے دل کا درد اب ملّا کو کہنا آگیا

فروری ۱۹۴۵ء

(۲)

حیات اک سازِ بے صدا تھی سرودِ عمرِ رواں سے پہلے
بشر کی تقدیر سو رہی تھی خطائے باغِ جناں سے پہلے

نظر نے کی نذرِ روح و دل پیش لب پہ شورِ فغاں سے پہلے
ادا ہوا سجدۂ محبت خروشِ بانگِ اذاں سے پہلے

بدل گیا عشق کا زمانہ کہاں سے پہونچا کہاں فسانہ
انھیں بھی مجھ پر زبان آئی وہی جو تھے بے زباں سے پہلے

کسے خبر تھی کہ بن کے برقِ غضب گرے گا یہی چمن پر
وہ حسن جو مسکرا رہا تھا نقابِ ابرِ رواں سے پہلے

ستم تو شاید میں بھول جاتا اگر یہ نشتر چبھا نہ ہوتا
وہ اک نگاہِ کرم جو کی تھی نگاہِ نامہرباں سے پہلے

نظر ہے ویراں مری تو کیا غم نظر کے جلوے تو ہیں سلامت
نہ تھے تم اتنے حسین میری محبتِ رائگاں سے پہلے

تری طرف پھر نظر کروں گا نشاطِ ہستیِ جاودانی
خرید لوں لذتِ الم کچھ متاعِ عمرِ رواں سے پہلے

بچھڑ گئے راہِ زیست میں ہم تمہیں بھی اس کا اگر ہے کچھ غم
چلیں وہیں سے پھر آؤ باہم چلے تھے ہم تم جہاں سے پہلے

قفس کی لوہے کی تیلیاں اب انھیں کی ضربوں سے خونچکاں ہیں
یہی جو تھے منتشر سے تنکے تصوّرِ آشیاں سے پہلے

چمن میں ہنسنے سے پھر نہ روکوں گا غنچۂ سادہ لوح تجھ کو
مگر ذرا آشنا تو ہو جا طبیعتِ باغباں سے پہلے

نظر کے شعلے دلوں میں اک آگ ہر دو جانب لگا چکے ہیں
بس اب تو یہ رہ گیا ہے باقی کہ لَو اُٹھے گی کہاں سے پہلے

نہ ڈھونڈو ملّا کو کارواں میں پھرے گا صحرا میں وہ اکیلا
کسی سبب سے جو تا بہ منزل نہ آ سکا کارواں سے پہلے

مئی ۱۹۴۵ء

گمراہ مسافر

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا

اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر
دیوار پسِ دیوار ملی دیوار میں دروازا نہ ملا

ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے
اک لکڑی تو اندھے کو ملی آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا

جرّاحِ خرد آتا ہی رہا صد مرہمِ اکسیری لے کر
جو زیست کے زخموں کو بھر دے ایسا کوئی پھاہا نہ ملا

ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیا
جس میں اک تہہ تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعا نہ ملا

دولت کا مغنّی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر
ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا

رقاصۂ عشرت نے آکر پھر دل سے نکالیں کچھ پھانسیں
لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا

تقسیم مساوی کے حامی پھر لے کے بڑھے میزاں اپنا
جو سب کو یکساں تول کے دے میزان میں وہ پلّا نہ ملا

بیچاری اُلفت کی مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی
لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا

اِدھر پھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہِ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

مارچ ۱۹۴۵ء

یومِ انتقام

کب تک بشر رہے گا اسیرِ خیالِ خام
اوہام پر فریفتہ الفاظ کا غلام

(۱)

وہ خطۂ بہار

جو پل رہا ہے گود میں طوفان و باد کی — جس کے بلند نخل صفیں دیوزاد کی
اُبھرا ہوا ہر اک رخِ تاباں کا خال و خد — جس کی حیات پر نہیں مجبوریوں کی حد

ننھی خرد کا جس پہ نہ کچھ چل سکا نظام
پرچم اُڑا رہا ہے جو فطرت کا لیکے نام
دنیا کی اصطلاح میں جنگل ہے وہ مقام

(۲)

وہ پارۂ زمیں

جس کی رگوں میں خشک ہوا زیست کا لہو　　جس سے کہ چھین لی گئی ہر قوتِ نمو
ہر ذرّہ ذرّہ جس کا شکستہ و خستہ حال　　صدیوں سے کر رہا ہے جہاں جس کو پائمال

کوہِ گراں کی زد پہ جہاں زندگی کاہ
جو کارواں کی ضربِ قدم سے ہے بے گیاہ
دنیا کی اصطلاح میں اس کا ہے نام راہ

(۳)

روندی ہوئی پی راہ

چلنے نہ پائے اس پہ اگر کوئی راہ رو　　ڈالیں نہ سنگ و خشت کے رہ رہ کے بارِ نو
بن جائے کچھ دنوں میں پھر اک وادیِ حسیں　　گہوارۂ بہار، گل و لالہ آفریں
صد مخزنِ لطافت و گوہر بدامنے　　فردوس درکنار و بہ آغوش گلشنے

اک جوئے آتشیں کے اُبلنے کی دیر ہے
سینہ سے پتھروں کے پگھلنے کی دیر ہے

۲۹۴

بس کارواں کے رُخ کے بدلنے کی دیر ہے

زیرِ زمیں سے آنے لگا ہے پھر اک پیام

فطرت منانے والی ہے کیا یومِ انتقام

دسمبر ۱۹۴۵ء

سنہ ۱۹۳۶ء

غزلیات

(۱)

جب کبھی امن کی انساں نے قسم کھائی ہے
لبِ ابلیس پہ ہلکی سی ہنسی آئی ہے

عشق جس دل میں نہیں تکملۂ کیف نہیں
زندگی نیم کشیدہ سی اک انگڑائی ہے

دل میں اک برق کو آسودہ کیا ہے میں نے
تب کہیں جا کے نظر میں تڑپ آئی ہے

میں تری غفلتِ پیہم سے بھی مایوس نہیں
میں نے بے لوث محبت کی قسم کھائی ہے

شمع اک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جان آئی ہے

قصۂ دل کے ہیں دو باب ہمیشہ سے یہی
پہلے تقصیر ہے پھر ذوقِ جبیں سائی ہے

ہاں اسی زیست کے ایسے بھی ہیں کچھ نظارے
موت کی آنکھ جنھیں دیکھ کے شرمائی ہے

چشمِ خونبار میں باقی نہ رہا کیا کوئی اشک
آج بیمارِ محبت کو ہنسی آئی ہے

آ گئی ختم پہ بازیٔ دلِ ناکام تری
مات کھانا ہی جسے چل کے وہ چال آئی ہے

یہ بھی درکار ہے رعنائیِ گلشن کے لئے
وہ جو بازو میں اسیروں کے اک انگڑائی ہے

اپنی محفل میں ابھی تک ہیں وہی جام پہ جام
اور دنیا ہے کہ انگڑائی پہ انگڑائی ہے

تیری بیگانہ روی کا نہ کروں گا شکوہ ورنہ کانٹوں سے بھی پھولوں کی شناسائی ہے

عشق مفلس کا ہے اک نیم کشیدہ سی شراب اور جوانی بھی ادھوری سی اک انگڑائی ہے

ہم کو معلوم ہے محفل میں مقامِ ملّا چمنِ شعر میں اک لالۂ صحرائی ہے

جذبۂ عشق ترا خام ابھی ہے ملّا
تیرے دل میں ابھی اندیشۂ رسوائی ہے

جنوری ۱۹۴۶ء

(۲)

خبر آئی ہے چمن میں نہیں دور وہ زمانا
کہ قفس کی تیلیوں ہی سے بنے گا آشیانا

مجھے کر چکی تھی وقفِ شبِ غم تری جدائی
تجھے یاد کر کے سیکھا مرے غم نے مسکرانا

وہ عجب گھڑی تھی نظریں مری تجھ سے جب ملی تھیں
مگر ایک دم کو جیسے کہ ٹھہر گیا زمانا

مری اجنبی نظر سے تمہیں کیوں کوئی گلہ ہو
میں تمہیں بھلا چکا ہوں مرے سامنے نہ آنا

اسے پا کے کھو چکا ہوں مجھے اب یہ دیکھنا ہے
کہ مرے نصیب میں ہے کبھی کھو کے اس کو پانا

مری زیرِ لب حقیقت کی اسے خبر نہ ہوتی
وہ تو یہ کہو کہ دنیا نے بنا دیا فسانا

کوئی کہہ رہا ہے جیسے مرے غم کی تیرگی میں
میں بجھا چکا ہوں جن کو وہ دیے نہ پھر جلانا

تری فکر اور عمل میں نہیں کوئی ربط ملا
تری زندگی غلامی ترا ذہن باغیانا

فروری ۱۹۴۶ء

(۳)

زیست ہے اک معصیت سوزِ دلی تیرے بغیر
ہاں محبت بھی ہے اک آلودگی تیرے بغیر

شامِ غم تیرے تصور ہی سے آنکھوں میں چراغ
ورنہ میرے گھر میں ہو اور روشنی تیرے بغیر

یہ جہاں تنہا بھلا کیا مجھ کو دے پاتا شکست
میں نے کب کھایا فریبِ دوستی تیرے بغیر

رات کے سینہ میں ہے اک زخم جس کا نام چاند
اک سنہری جوئے خوں ہی چاندنی تیرے بغیر

ہر نفس ہے پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا
زیست ہے اک مستقل شرمندگی تیرے بغیر

دے گئی دھوکا مگر شائستگیِ غم مری
آ رہا ہے دل پہ الزامِ خوشی تیرے بغیر

علم و عقل و نام و جاہ و زور و زر سب ہیچ عشق
ہو کے سب کچھ بھی نہیں کچھ آدمی تیرے بغیر

دل کی شادابی کی ضامن ہے تو ہی اے یادِ دوست
آ نہ پائی غم کے پھولوں میں نمی تیرے بغیر

ایک اک لمحہ میں جب صدیوں کی صدیاں کٹ گئیں
ایسی کچھ راتیں بھی گزری ہیں مری تیرے بغیر

زندگی ملّا کی ہے محجوبِ نامِ زندگی
رہ گئی ہے شاعری ہی شاعری تیرے بغیر

اپریل ۱۹۴۶ء

(۴)

ہر جلوہ پہ نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
آنکھوں کو خضرِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

مٹنے نہ پائے تازگیِ لذّتِ گناہ
توبہ بھی گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں

کیسی یہ زندگی ہے کہ پھر بھی ہے شوقِ زیست
گو ہر نفس اک آہ کیے جا رہا ہوں میں

اشکوں کی مشعلوں کو فروزاں کیے ہوئے
طے التجا کی راہ کیے جا رہا ہوں میں

خود جس کے سامنے سپر انداختہ ہے حسن
ایسی بھی اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

شاید کبھی وہ بھول کے رکھیں اِدھر قدم
آنکھوں کو فرشِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

بڑھتی ہی جا رہی ہیں تری کم نگاہیاں
کیا دل میں تیرے راہ کیے جا رہا ہوں میں

ظلماتِ دیر و کعبہ میں کچھ روشنی سی ہے
شاید کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مُلّا ہر ایک تازہ مصیبت پہ ہنس کے اور
کج گوشۂ کلاہ کیے جا رہا ہوں میں

اپریل ۱۹۴۶ء

(۵)

دل میں ناکامی کی جب تک خستگی ہوتی نہیں
عشق کی اُس وقت تک تکمیل سی ہوتی نہیں

عشق کی آزردگی آزردگی ہوتی نہیں
ٹوٹتا ہے دل محبّت میں کمی ہوتی نہیں

زندگی امید سے خالی کبھی ہوتی نہیں
روشنی بجھ کر بھی دل میں تیرگی ہوتی نہیں

اشک کچھ ایسے بھی ہیں جن میں نمی ہوتی نہیں
دل سلگتا ہے نظر میں روشنی ہوتی نہیں

دل کی زنجیریں نہ ٹوٹیں توڑ دی ہر رسم و راہ
اجنبی بنتے ہیں اور بیگانگی ہوتی نہیں

اک ذرا کام و دہن کی تربیت درکار ہے
ورنہ یہ مینا میں جو شے ہے بُری ہوتی نہیں

اے خدائے رنج و راحت بخت انساں کی قسم
بے زباں بندوں سے بھی اب بندگی ہوتی نہیں

کیوں ستم سے تم اُٹھاؤ ہاتھ میں یوں بھی ہوں خوش
کیا تمہیں خوش دیکھ کر مجھ کو خوشی ہوتی نہیں

فطرت انساں نہ بدلی ہے نہ بدلے گی کبھی
یوں نئی کہنے سے کچھ دنیا نئی ہوتی نہیں

کر چکا تیرا تغافل کام اپنا ساقیا
اب تو ساغر دیکھ کر بھی تشنگی ہوتی نہیں

دل میں اک سچی ندامت آگئی جن کے لئے
وہ خطائیں لاکھ ہوں آلودگی ہوتی نہیں

بند منھ کرنے سے ملا کیا بھرے گا زخم دل
اندر اندر خون بہنے میں کمی ہوتی نہیں

مئی ۱۹۴۶ء

(۶)

وہ کرم ہو یا ہو ستم ترا جو ہو مجھ پہ یوں تو بُرا نہ ہو
ترے مرتبے سے بھی کم نہ ہو مرے ظرف سے بھی سوا نہ ہو

یہ قدم قدم کی شکستگی یہ نفس نفس کی گرفتگی
مری زندگی کا سرا لیے کوئی دشمنوں کا خدا نہ ہو

تری پختہ کاریِ ناز کا ہے ہر ایک وار چنچا تُلا
وہ مذاقِ تیرِ نظر ترا کہ خطا بھی ہو تو خطا نہ ہو

دلِ صبر کُن تجھے چاہیے کہ ہو خستگی میں بھی نغمہ زن
کہ وہ آئینہ نہیں موم ہے جو شکستہ ہو تو صدا نہ ہو

یہ ہے کون منزلِ عاشقی کہ جو یاد لے ہر اک گھڑی
کہیں اتفاق سے جب ملے تو کوئی سلام و دعا نہ ہو

اگست ۱۹۴۶ء

لال قلعہ

روکے گا تجھے اب کون وطن کھوئی ہوئی عظمت پانے سے
پھر لال قلعہ کی دیواریں دہراتی ہیں افسانے سے
ذرّہ ذرّہ خود اپنی جگہ جن کا ہیرا اور پنا تھا
ان دیواروں کی قسمت میں زندانِ فرنگی بننا تھا
معراجِ وطن بھی دیکھ چکیں تاراجِ وطن بھی دیکھ لیا
اپنے دل پر پتھر رکھ کر سن ستاون بھی دیکھ لیا
دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجی اور یہ پنبہ در گوش رہیں
رنگون کے قیدی کی آنکھیں نکلیں پھر بھی خاموش رہیں
چپکے چپکے رودادِ وطن کا درسِ تباہی دیتی ہیں
تاریخ کے کن کن جرموں کی خاموش گواہی دیتی ہیں

اک معرکۂ تاریخی ہے پھر آج انھیں دیواروں میں
ہمّت والے مجبوروں میں طاقت والے مختاروں میں
آئینِ حکومت اک جانب، آئینِ خدا ساز اک جانب
قانون کے الفاظ اک جانب اور دل کی آواز اک جانب
سوگندِ سپاہی ایک طرف، عہدِ وطنیّت ایک طرف
بے روح سے جملے ایک طرف، سینوں کی حرارت ایک طرف
کاغذ کی قسم کیا سب کچھ ہے، فطرت کا تقاضا کچھ بھی نہیں؟
کھائی تھی جو اس کے سینے پر وہ دل کی قسم کیا کچھ بھی نہیں؟
کب دل کی آگ دبا پائی رسمی عہدوں کی سرد آبی
نبضوں کی دہکتی گرم روی، سانسوں کی سلگتی بے تابی
جب دل لَو دینے لگتا ہے، پھر کھوٹی عقل پگھلتی ہے
زنجیرِ غلامی کی کڑیوں سے بھی اک آنچ نکلتی ہے
شوقِ آزادی ہر ذی حس انساں کے دل کا جذبہ ہے
اقدامِ بغاوت محکوموں کی خودداری کا حربہ ہے

لاوارث ہند کی فوجوں کو غربت میں وطن کی یاد آئی
اک خواب سا بن کر پیشِ نظر تصویرِ جہاں آباد آئی
خاموش اُداسی ان دیواروں کی اک نشتر بن کے چُبھی
جو پہلی چوٹ پلاسی میں کھائی تھی ہوئی سینوں میں ہری
اک نقشِ وفا اُبھرا دل میں کچھ آنکھوں سے پردے سرکے
پھر ہلدی گھاٹ کا خوں کھولا، پانی پت کے ذرّے چمکے
اک ہُوک سی اُٹھی سینوں میں پھر لڑکے حکومت ہاتھ میں لو
ہر لب پہ پکار آئی دل کی، دہلی کو چلو، دہلی کو چلو
مجبوروں کی غیرت جاگی، جانبازیِ غیرت کیا کہیئے
جس جرم پہ نیکی وجد کرے اس جرم کی عظمت کیا کہیئے
اس جنگ میں اپنے نذرانے ہر خاکِ وطن نے پیش کیے
ہر گھر نے دیے اپنے موتی ہر گود نے اپنے پھول دیے
ہمّت کی روایاتِ ماضی میں روح و جوانی پھر آئی
میداں میں نکل کر تیغ بکف جھانسی کی رانی پھر آئی

آزاد وطن کے پرچم میں ہر رنگ کے رشتے سل ہی گئے
جے ہند کے مرکز پر آکر جتنے خط تھے سب مل ہی گئے

جے ہند کے نعرے پہونچے ہیں پھر آج انھیں ایوانوں میں
جو پہلے پہل گونجے تھے ملایا کے خونی میدانوں میں

ان نعروں میں اُمید بھی ہے، پیغام بھی ہے اور عزم بھی ہے
فردا کا سازِ بزم بھی ہے، امروز کا عہدِ رزم بھی ہے

بجلی کی کڑک بھی ان میں ہے شعلوں کا ہیبت آہنگ بھی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی ہنستی کرنوں کا سنہرا رنگ بھی ہے

ہر پردۂ ظلمت چیر کے پھر صد جلوہ بداماں آتی ہے
اب اس میں تو کوئی شک ہی نہیں اک صبحِ درخشاں آتی ہے

پھر آزادی کا پرچم ان دیواروں پر لہرائے گا
وہ دن آئے گا جلد آئے گا اور یقیناً آئے گا

جنوری ۱۹۴۶ء

نذرِ بجنور

(یو۔پی اسمبلی کے جنرل الیکشن میں بجنور سے حافظ محمد ابراہیم صاحب کی شاندار کامیابی پر)

خاکِ بجنوری اثری عظمت مسلّم آج ہے — تو وطن کی اک زیارت گاہِ اعظم آج ہے

اور سب شہروں سے اونچا تیرا پرچم آج ہے — لیگ کی گھائل صفوں میں تیرا ماتم آج ہے

تجھ میں کتنے اسودی سینوں کی عیدیں دفن ہیں

کتنی داغی کرم آلودہ امیدیں دفن ہیں

تیرا پرچم نغمہائے حریّت گاتا ہوا — اُڑ رہا ہے تیرگی پر نور برساتا ہوا

چوٹیوں پر قصرِ آزادی کی لہراتا ہوا — دل میں کیا کیا اپنی خوش رنگی پہ اِتراتا ہوا

دیکھ کر اس کی سہ رنگی ہر طرف چھائی ہوئی

قوس ہے بامِ فلک پر آج شرمائی ہوئی

یہ زبانِ حال سے دیتا ہے مسلم کو پیام — لے کہ تیرا سنگ بنیادی ہے اک جمہورِ عام!

بندگانِ خود پرستی اور ہوں تیرے امام؟ — حافظانِ دین و ملّت طالبانِ جاہ و نام؟

تیرے باغیچہ میں گنجائش ببولوں کی نہیں

اس خزاں پر بھی کمی اتنی تو پھولوں کی نہیں

یہ نفاقِ باہمی لے کم نظر زندہ نہ کر دیکھ یوں اپنی غلامی آپ پایندہ نہ کر
تجھ کو ہمّت کی قسم کچھ خوفِ آئندہ نہ کر اپنے اجمل خان و انصاری کو شرمندہ نہ کر

جنگِ آزادی ہو اور لڑنے پہ تو راضی نہ ہو
اب تجھے اتنا بھی پاسِ عظمتِ ماضی نہ ہو

کیا تجھے یاد اپنی تاریخِ کہن کچھ بھی نہیں کیا ترے آئین میں حقِّ انجمن کچھ بھی نہیں
آشیانہ ہی ہے سب کچھ اور چمن کچھ بھی نہیں کیا مسلمانوں کے ایماں میں وطن کچھ بھی نہیں

بابِ قومی کون ہے جس میں نہیں عنواں ترا
اس زمیں کے چپّہ چپّہ میں ہے "پاکستان" ترا

مارچ ۱۹۴۶ء

آخری سلام

(عاشق سماج سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ لاکر محبوبہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے محبوبہ اُسے خط لکھتی ہے)

رخصت اے روحِ تمنّا الوداع اے جانِ شوق — جا رہے ہو کر کے ویراں تم مرا ایوانِ شوق
بھولنے والے مرے دے کر مجھے پیمانِ شوق — بیوفائی کا گلہ لیکن نہیں ایمانِ شوق

میں تمہیں جانے سے روکوں کون ہوں؟ کوئی نہیں
جاؤ جاؤ شوق سے میرا تو حق کچھ بھی نہیں

میں کسی ماں باپ کی بیچی ہوئی لڑکی نہیں — میں نے عہدِ عشق میں کوئی تجارت کی نہیں
اندھے گونگے دیوتاؤں کی گواہی لی نہیں — تم کو سب کچھ دیدیا قیمت کوئی مانگی نہیں

جس کو اپنا میں نے سمجھا اُس کو اپنا کرلیا
دو دلوں کا مل کے چار آنکھوں لے سودا کرلیا

دل کو سینہ میں نہ رکھا میں نے تربت کی طرح — آرزو کی قدر کی زندہ حقیقت کی طرح
اس سیہ خانہ میں جی معصوم فطرت کی طرح — تم سے کی میں نے محبت اور محبت کی طرح

یہ مٹاتی ہے اسی کو عشق جس کا کیش ہے
ہائے دنیا کس قدر نا عاقبت اندیش ہے

یوں مگر اُڑ جائیں جو سینوں کی تصویریں نہیں   مٹنے والی دفعتاً نظروں کی تحریریں نہیں
یک بیک گر جائیں جو الفت کی تعمیریں نہیں   ایک جھٹکے میں جو ٹوٹیں دل کی زنجیریں نہیں

خود بخود رہ رہ کے تم اک یاد میں کھو جاؤ گے
اور اتنی دیر کو تم پھر مرے ہو جاؤ گے

رفتہ رفتہ زندگی اپنا بناتی جائے گی   خون میں پانی کی آمیزش بڑھاتی جائے گی
عقل جاگے گی تو دل کو نیند آتی جائے گی   ایک جھوٹی مصلحت ہر شے پہ چھاتی جائے گی

تم بھی ہو جاؤ گے آخر کامیابِ زندگی
عشق کو سمجھو گے دیوانوں کا خوابِ زندگی

مرد کو سو مشغلے ہیں دل لگانے کے لئے   رزم و بزمِ زندگی جوہر دکھانے کے لئے
دفتر و بازار قسمت آزمانے کے لئے   لیکن اک عورت کرے کیا غم بھلانے کے لئے؟

پھر بسا کر دل کو اپنے خانہ ویراں دیکھنا
جاگنا اور پھر وہی خوابِ پریشاں دیکھنا

یہ تو ممکن ہے کہ کم ہو جائے جوشِ اضطراب   آرزو پیدا کرے دنیائے دل میں انقلاب
پھر نظر آئے کسی صورت میں اُمیدوں کا خواب   زندگی پھر زندگی ہو اور شباب آخر شباب

طبع لیکن سوچ کر یہ بھی سکوں پاتی نہیں

صبح کے خوابوں سے شب کی تیرگی جاتی نہیں

تم گئے اچھا کیا مجھ کو اب اس کا غم نہیں — یادِ عہدِ عشق عہدِ عشق سے کچھ کم نہیں
ہاں میں خوش ہوں میری بزمِ زیست میں ماتم نہیں — آہ ہونٹوں پر نہیں آنکھیں مری پُر نم نہیں

روشنائی پھیلی پھیلی سی جو خط میں ہے کہیں
یہ عرق کی بوندیں ٹپکی ہیں مرے آنسو نہیں

تیرگی میں زیست کی دو دل نبوت کر چکے — نامِ الفت لینے والے ترکِ الفت کر چکے
لب مرے جو کچھ بھی کرنا تھی شکایت کر چکے — ختم افسانہ ہوا ہم تم محبت کر چکے

بھیجتی ہوں اپنی مینا کا یہ جامِ آخری
جانے والے جا تجھے دل کا سلامِ آخری

اگست ۱۹۴۶ء

شیوۂ حسن

آگ لگائی آکے پاس آگ لگا کے دُور دُور
شیوۂ حسن ہے یہی اپنا بنا کے دُور دُور
پائے نہ اضطرابِ عشق کوئی سکوں کسی طرح
دُور بھی جا کے پاس پاس، پاس بھی آکے دُور دُور

دسمبر ۱۹۴۶ء

سنہ ۱۹۴۶ء

غزلیات

(۱)

کچھ اس ادا سے آج وہ جلوہ دکھا گئے
ہر وادیٔ نگاہ کو ایمن بنا گئے

ہر حسنِ ماسوا کے ستارے بجھا گئے
وہ ٹھن بن کے آئے اور آنکھوں پہ چھا گئے

ہم ان سے کہہ سکے نہ کبھی داستانِ شوق
عنوان کیسے کیسے نگاہوں میں آ گئے

اہلِ نظر نے اور بڑھا دی بہائے حسن
اک اک ادا پہ دل کے خزانے لٹا گئے

رکتی نہیں کسی کے لئے موجِ زندگی
دھارے سے جو ہٹے وہ کنارے پہ آ گئے

آج اک غرورِ حسن بھی شامل ہے حسن میں
شاید کسی نگاہ کا کچھ بھید پا گئے

گم کتنے کارواں ہوئے ایماں کے نور میں
اچھے رہے جو سایۂ اُلفت میں آ گئے

وہ دل پھر اس کے بعد نہ تاریک ہو سکا
جس میں دیے وہ اپنی نظر سے جلا گئے

جو اشک تھے ہوئے صرفِ گدازِ دل
جو ننگِ خانداں تھے وہ آنکھوں میں آ گئے

ایامِ فصلِ گل کا پھر آنا تو کچھ نہ تھا
یہ آئے اور یاد کسی کی دلا گئے

واعظ نے یوں بیان کیں کوثر کی لذتیں — تھے جتنے رندِ خام وہ باتوں میں آ گئے

ملّا کسی سے شکوۂ غفلت کروگے کیا
سچ بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہچکچا گئے

مارچ ۱۹۴۷ء

(۲)

بھٹکے ہوئے انساں کو پھر سے آگاہِ رہِ منزل کر دے
اے دل کی حقیقت پردہ اٹھا ہر نقشِ خرد باطل کر دے

کانٹے چھلنے سے کیا حاصل اک بار مذاقِ سبزہ و گل
جس میں کانٹے جم ہی نہ سکیں وہ سیرتِ آب و گل کر دے

جس رنگ کی تہہ میں ہو نہ لہو تہذیب کا غازہ اس کو بنا
جس نور میں ہو شعلہ کی نہ خو، اس سے روشن محفل کر دے

کب تک ہر ساحلِ ہستی کا اک رزمگہِ امواجِ فنا
ہر موج کے سینے میں پیدا آسودگیِ ساحل کر دے

اے گرم رویِ زیست ذرا آہستہ خرامی تھوڑی سی
یہ تیز تنفّس ہی تیرا جینا نہ کہیں مشکل کر دے

ماضی کی شبِ تاریک میں گم ہو جائے یہ مہرِ تاباں بھی
اک صبحِ نو میں نور اپنا ہر ذرّہ اگر شامل کر دے

ہر قوم سے لے کر رنگ اس کا اک قوسِ عالمگیر بنا
اس رنگیں قوس کو محرابِ دانش گہِ مستقبل کر دے

جنّت کے مجاہد کی سوگند تجھے اے روحِ پاکِ بشر
اس دیر و حرم کی دنیا کو انساں کے کبھی قابل کر دے
ملّا پہ جتا اپنی نہ عطا غیرت کو نہ اس کی ٹھیس لگے
ٹھکرا کے ترا ہر لطف و کرم انکار نہ وہ سائل کر دے

مارچ ۱۹۴۷ء

(۳)

کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جبتک مزاجِ دل نہ بن جائے

دلوں کی بے حجابی ہی حجابِ دل نہ بن جائے
محبت بڑھ کے خود اپنے لئے قاتل نہ بن جائے

مقامِ بےخودی تک شوق کو لا پھر نہیں ممکن
قدم جس سمت بھی اُٹھے رہِ منزل نہ بن جائے

خرد کے ہاتھ میں دل کا سفینہ سونپنے والے
تری جولانگہِ کشتی حدِ ساحل نہ بن جائے

بدلتی زندگی میں کیا حقیقت اور کیا باطل
حقیقت آج کی کل کے لئے باطل نہ بن جائے

خبر لے نغمہِ سازِ شکستہ چھیڑنے والے
ترا نغمہ ہی خود برہم زنِ محفل نہ بن جائے

نکل دیر و حرم سے طالبِ جنت مرادمہ
اگر پھر یہ جہاں خود جنتِ حاصل نہ بن جائے

ترا باطن اگر روشن نہیں بیکار ہیں آنکھیں
نظر بے نور ہے جب تک شعاعِ دل نہ بن جائے

مقامِ ترکِ اُلفت پر نہ جانے کب سے ہے مُلّا
یہی اس کی وفا کی آخری منزل نہ بن جائے

اپریل ۱۹۴۷ء

(۴)

شکستِ غم کو دلِ کامیاب کیا جانے
یہ تو یہ دھوپ شبِ ماہتاب کیا جانے

کرم کرم ہے تو حدّ و حساب کیا جانے
یہ شہر ہے وہ بیاباں سحاب کیا جانے

نیازِ شوق کوئی شرط جانتا ہے نہ عذر
زبانِ عشق سوال و جواب کیا جانے

اُلجھ کے رہ گئی حسنِ نقاب میں جو نظر
وہ حسنِ جلوۂ زیرِ نقاب کیا جانے

وہ باخبر تو ہے شاید مرے الم سے مگر
نفس نفس کا مرے اضطراب کیا جانے

بہک گیا کوئی پی کر تو مے کا کون قصور
کمی ظرف کو کیفِ شراب کیا جانے

ہوس کا وہ سخنِ پُر تکلّف و رنگیں
خلوصِ عشق کا سادہ خطاب کیا جانے

بہے ہیں کتنے ستاروں کے اشک آخرِ شب
سحر کا ہنستا ہوا آفتاب کیا جانے

محبّت آج بھی ہے حاصلِ حیاتِ بشر
حقیقتِ ابدی انقلاب کیا جانے

یہ سیر کاموں کی باتیں ہیں سب ارے ملّاؔ
نصیبِ تشنہ لبی اجتناب کیا جانے

اپریل ۱۹۴۷ء

(۵)

اب اپنے دیدہ و دل کا بھی اعتبار نہیں — اسی کو پیار کیا جس کے دل میں پیار نہیں

نہیں کہ مجھ کو طبیعت پہ اختیار نہیں — ہر ایک جام سے پی لوں وہ بادہ خوار نہیں

ہر ایک گام پہ کانٹوں کی ہیں کمیں گاہیں — شبابِ آہ شگوفوں کی رہ گزار نہیں

بھری ہوئی ہے وہ کام و دہن میں تلخیٔ زیست — کہ لب پہ جامِ محبت بھی خوشگوار نہیں

نہ میرے اشکوں سے دامن پہ تیرے آئے گی آنچ — یہ شعلہ رو ہیں مگر فطرتِ شرار نہیں

کہیں چھپائے سے چھپتی بھی ہے حقیقتِ غم — وہ غم ہی کیا جو مسرت سے آشکار نہیں

میں تیری یاد سے بہلا چکا ہوں یوں دل کو — کہ اب مجھے تری فرقت بھی ناگوار نہیں

مرے سکوں کے لئے کیوں یہ کوششِ پیہم — قرار چھیننے والے تجھے قرار نہیں

جہانِ عقل کے نفرت کدوں میں بٹ جاتا — ہزار شکر محبت پہ اختیار نہیں

کسی کی لوٹ کے راحت خوشی نہیں ملتی — خزاں کے ہاتھ میں سرمایۂ بہار نہیں

نگاہِ دوست کو اس کی بھی ہے خبر لیکن — وہ راز جس کا ابھی دل بھی راز دار نہیں

توجہِ نگہِ یار کا سبب معلوم
دل گرفتۂ ملّا ابھی شکار نہیں

ستمبر ۱۹۴۷ء

(۶)

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

خوشی کی معرفت اور غم کی آگہی نہ ملی
جسے جہاں میں محبّت کی زندگی نہ ملی

جگر نہ تھا کہ کوئی پھانس سی چُبھی نہ ملی
جہاں کی خاک اُڑائی کہیں خوشی نہ ملی

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

لبوں پہ پھیل گئی ایک موجِ غم اکثر
بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی

طوافِ شمع پتنگوں کا جل کے بھی ہے وہی
جگر کی آگ سے آنکھوں کو روشنی نہ ملی

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

فلک کے تاروں سے کیا دور ہو گی ظلمتِ شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی

ابھی شباب ہے کر لیں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پہ عمرِ رواں ملی نہ ملی

وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار
رہِ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی

وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے مُلاؔ
کسی نگاہ کے سایے کی چاندنی نہ ملی

نومبر ۱۹۴۷ء

آ ہی گیا

حکمِ معزولی بہ نامِ تیرگی آ ہی گیا
وادیِ شب میں پیامِ روشنی آ ہی گیا

روشنی ڈوبے ہوئے تاروں کی کام آ ہی گئی
آج ہر ذرّے میں نورِ کوکبی آ ہی گیا

چیرتا ظلمت کو تہہ در تہہ سحاب اندر سحاب
پھر اُفق پر آفتابِ زندگی آ ہی گیا

اک مہک دینے لگے کھلتے ہوئے سے برگِ گل
اب چمن میں ختمِ دورِ غنچگی آ ہی گیا

انجمن میں تشنہ کاموں کی بہ صد مینا و جام
آج ساقی لے کے اذنِ مے کشی آ ہی گیا

گھاؤ جن کانوں میں تھے آقا کے حرفِ تلخ کو
اُن میں اک نغمہ بہ لحنِ مادری آ ہی گیا

تیشۂ فرہاد بہرِ قصرِ خسرو تابہ کے
کوہکن کی زد پہ قصرِ خسروی آ ہی گیا

دورِ آہن، دورِ ایماں، دورِ شاہی، دورِ زر
روندتا ان سب کو دورِ آدمی آ ہی گیا

اے عروسِ ہند کے بکھرے ہوئے موتی کے ہار
گوندھنے پھر تجھ کو تیرا جوہری آ ہی گیا

شمع رکھی جا رہی ہے ہندِ نَو کے سامنے
نظمِ افرنگی کا شعرِ آخری آ ہی گیا

اک حقیقت بن کے ملا خوابِ ارمانِ وطن
اے زہے قسمت کہ اپنے جیتے جی آ ہی گیا

اگست ۱۹۴۷ء

صبحِ آزادی

شب مُردہ کی لئے لاشِ حسیں شانوں پر
گُنگناتُ جس کا ابھی تک ہے بدن
رقص کرتا ہوا آتا ہے نیا طفلکِ صبح
صبحِ آزادیِ زندانِ وطن
لڑکھڑاتے ہوئے اس بارِ گراں کے نیچے
بہکے بہکے ابھی پڑتے ہیں قدم
پھر بھی اک خلدِ نظر جنّتِ کیف
مستیِ رقص سے ہر عضوِ حسیں نشہ میں چور
تن پہ زرتار سہ رنگی پوشاک

زعفراں، سبز و سفید
جو سرکتی ہے ہر اک جنبشِ پا سے کچھ اور
نگہہِ گرم تمنّا کے لئے اک ھمیز

اور اندر سے فروزاں وہ دہکتا ہوا جسم
جیسے فانوس میں اک شعلۂ لرزاں کی تڑپ
رفتہ رفتہ جو ابھرتا ہی چلا آتا ہے
گلِ نورس کوئی جیسے چمنستان میں کھلے
شوخ، طرّار، جواں گام، سبک رو، مغرور
دلربائی پہ جسے اپنی بھروسہ پورا۔
لب پہ ہلکی سی وہ اک موجِ تبسم غلطاں
جس میں انگڑائیاں لیتا ہے امیدوں کا شباب
اور مچلتے ہوئے ارماں بیتاب
اس کی نظروں میں ہے اک خوابِ حیات
اس کی ہر جنبشِ پا ہے کہ ہے مضرابِ حیات
جس سے دیتا ہے گزرتے ہوئے انفاس پہ تال
گرم رو، برق خرام
موجِ صرصر میں اڑاتی ہوئی پرچم اک لَو
اور تیزی سے بجاتا ہوا اپنے گھنگھرو

جس کے ہر بول کی گونجی ہوئی آواز میں ہے
قلبِ ہستی کے دھڑکنے کی صدا
شوق کی زندہ و تابندہ و پایندہ شبیہہ
خوابِ ارماں کی سنہری تعبیر
لمحۂ حاصلِ زیست
جس کے سینہ میں نہاں ایک نشاطِ ابدی

اگست ۱۹۴۷ء

سجدۂ عقیدت

محفلِ دہر میں جتنے بھی نظام آئے ہیں
لیکے سب مژدۂ بہبودیِ عام آئے ہیں

پھر بھی ہے قافلۂ آلِ بشر دشت نورد
گو چمن بن کے ہزاروں ہی مقام آئے ہیں

تشنہ انساں کے لئے جرعۂ شیریں کہہ کر
قطرۂ تلخ وہی جام بہ جام آئے ہیں

آہ! نادان پتنگوں کی تباہی کے لئے
کتنی ہنستی ہوئی شمعوں کے پیام آئے ہیں

جلوۂ صبحِ مسرّت کی مناتے ہوئے عید
کتنے ایّام سیہ بختیِ شام آئے ہیں

اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے زہرِ آبِ حیات
بزم میں کتنے کھنکتے ہوئے جام آئے ہیں

کتنے طوفانِ جگر جوششِ صد موج لیے
چشم تک آئے تو کچھ قطرۂ خام آئے ہیں

زندہ باد ابلہ فریبیِ جہانِ معصوم
عقلِ کُل بن کے یہاں جہلِ تمام آئے ہیں

بھیس میں خضر کے آئے ہیں سکندر کتنے
کتنے راون ہیں جو جپتے ہوئے رام آئے ہیں

آشیاں رنگ قفس لائے ہیں کتنے صیّاد
کتنے شاہیں ہیں جو طاؤس خرام آئے ہیں

کتنے ظلمات کے پالے ہوئے سایۂ شب رنگ
بن کے اک طورِ سرِ منظرِ عام آئے ہیں

اونچی کرتے ہوئے ہر سانس سے لَو نفرت کی
کتنے تبلیغِ محبّت کے امام آئے ہیں

آستینوں میں لیے خون سے تر دشنۂ تیز
کتنے خوشبو بسے ہاتھوں کے سلام آئے ہیں

جن کی تلخی کے مقابل میں ہے حنظل بھی نبات
آہ کتنے لبِ شیریں سے کلام آئے ہیں

آنکھ اٹھتے ہوئے ڈرتی ہے سوئے بام فلک
کتنے فردوس نشیمن تہِ دام آئے ہیں

آہ کس دل سے یقین آئے کسی جلوہ کا
کتنے چڑھتے ہوئے سورج لبِ بام آئے ہیں

ابنِ آدم کے لئے جبر کے کتنے نئے دور
لیکے انساں کی مساوات کا نام آئے ہیں

خلد سازی کے ارادوں کے حسیں نقش و نگار
زینتِ طاقِ جہنم ہی کے کام آئے ہیں

ہاں سمجھتا ہوں بلندی میں نہاں ہے جو نشیب
پھر بھی کھاتا ہوں میں آج اپنی تمنا کا فریب
ایک سجدے کو شناسائے جبیں اور کردوں
دل کا اصرار ہے اک بار یقیں اور کردوں
اے وطن سر پہ نیا تاج مبارک تجھ کو
یومِ آزادیِ ہند آج مبارک تجھ کو

ستمبر ۱۹۴۷ء

انسانی درندے

غارت و قتل کی ہے گرمیِ بازار وہی
ابھی انسان کی ہے فطرتِ خونخوار وہی

رائگاں سعیِ خرد، علم کی دولت بے سود
جہلِ آدم کا جو تھا ہے ابھی معیار وہی

سب سے قانون بڑا آج بھی قانونِ قصاص
سب میں مضبوط دلیل آج بھی تلوار وہی

سطحی ہے فقط اخلاص و محبّت کی چمک
زیرِ آئینہ ابھی ہے تہہِ زنگار وہی

دیکھنے ہی کے لئے ہیں یہ خد و خالِ بشر
دل میں آباد ہے عفریتِ سیہ کار وہی

اُڑی چہرہ سے جہاں رنگِ تمدّن کی نقاب
ہے نگاہوں کے دریچوں سے شرربار وہی

ٹوٹی پتلی سی جہاں کھوکھلی تہذیب کی آڑ
نظر آتا ہے درندہ پسِ دیوار وہی

ایک سے ایک سوا کون کہے کس سے کہے
اہلِ تسبیح وہی، صاحبِ زنّار وہی

کس کو مظلوم کہیں، کس کو ستمگار کہیں
آج مظلوم وہی کل ہے ستمگار وہی

جتنا ہی جو تھا روادار کبھی اتنا ہی
آج ہم کیش لٹیروں کا طرفدار وہی

کتنے آباد ہیں نفرت کدۂ دیر و حرم
ہم پیالہ جو کبھی تھے یہ ہیں میخوار وہی

آج کس سطح پہ ہے ذہنیتِ عام افسوس
روکتا ہے جو خطاؤں سے خطاوار وہی

جو تشدّد کا کرے ذکر وہی قوم پرست　　نام بھُولے سے جو لے امن کا غدّار وہی

فرقہ وارانہ حکیموں کی دوا سے ہشیار　　بھیس میں آج معالج کے ہے بیمار وہی

وطن! اے میرے وطن! یوں مجھے مایوس نہ کر

شُبھ گھڑی آئی ہے تیری اسے منحوس نہ کر

اکتوبر ۱۹۴۷ء

مشاعرہ

قدیم اسکول

حضرت ریختہ:-

سو شعر کی بھی غزل میں پڑھ سکتا ہوں
کوئی ہو زمین میں شعر گڑھ سکتا ہوں

اُستاد ہوں میں ہر ایک مضمونِ قدیم
سانچہ پہ نئی طرح کے مڑھ سکتا ہوں

حضرت مشّاق:-

مضمون و زباں ہیں جیسے رُوح و قالب
ہوں اہلِ سخن سے داد کا میں طالب

کس رُخ سے لگا دیا ہے مصرعہ واللہ
جنّت میں تڑپ رہی ہے رُوحِ غالب

حضرت زعم:-

ہاں عظمتِ ذاتی کا مجھے پاس تو ہے
اوروں کو نہو خود مجھے احساس تو ہے

کرتا ہوں میں اپنے منھ سے اپنی تعریف
کچھ اور نہیں سر میں پہ آماس تو ہے

حضرت زباں:-

الفاظ کی اس سلکِ رواں کو دیکھو
ترشے ہوئے ہیروں کی دکاں کو دیکھو

ڈھونڈو نہ مرے شعر میں مضمون و پیام
کوثر سے دُھلی میری زباں کو دیکھو

حضرت صوفی :-

تو مجھ میں، میں تجھ میں، خُم میں مے، مے میں خُم　　میں رازِ حیات کے معمّے میں ہوں گُم
ہر شعر مرا ہے جیسے اک دومنھا سانپ　　دُم اس کی منھ ہے اور منھ اس کا دُم

حضرت فراری :-

جام و مے و نغمہ و گل و ابر و بہار　　ما ہے بہ فرازِ چرخ و ما ہے بہ کنار
میرے شعروں میں میرے خوابوں کی بہشت　　دُنیا کے جہنّم سے مجھے کیا سروکار

حضرت مبتذل :-

بازارِ ہوس پہ سکّہ رانی میری　　گلیوں میں کٹی ہے نوجوانی میری
کوٹھوں پہ لگی ہیں میرے دل کی مُہریں　　میرے اشعار زندگانی میری

جدید اسکول

حضرت نغمہ :-

نظروں کو مری اُترتے چڑھتے دیکھو　　آواز کی لے کو گھٹتے بڑھتے دیکھو
پڑھنے کے لئے نہیں ہیں میرے اشعار　　مجھ کو محفل میں شعر پڑھتے دیکھو

حضرت رُومانی :۔

اک حسن کے سانچے میں جوانی ڈھالی
پھر عشق کے خوابوں کی پچوڑی لالی
کوئی مرے شعروں میں نہ پہچان سکا
میری دوشیزہ کی وہ صورت کالی

حضرت رنگین :۔

رنگیں مری اچکن ہے تو بانکی ٹوپی
میری نظروں سے میرے شعروں کو پی
اک چشمہ صہبا ہوں مجسم مستی
صورت میں کنہیا ہوں صفت میں گوپی

حضرت سارق :۔

وقت اور محل دیکھ کے پڑھتا ہوں میں
بے خوف پرائے شعر پڑھتا ہوں میں
گرتا ہوں خواص کی نگاہوں سے تو کیا
نظروں میں عوام کی تو چڑھتا ہوں میں

حضرت واصلی :۔

میری ہی حیات ہے مراعرصہ جنگ
میرے غم و عیش میری دنیا کے ترنگ
دل میں اپنے چبھو چبھو کر نا خون
میرے ہی لہو سے ہے مرے شعر میں رنگ

حضرت مزدور :۔

کچھ حسنِ تصوّر کی ضیا میں نے دی
کچھ رنگِ عبارت سے جلا میں نے دی
پھر اپنے ترنّم کا سہارا دے کر
مزدور کو قدسیوں میں جا میں نے دی

حضرت تاجر:-

جیسا گاتا ہوں راگ ویسا سرگم
نبضِ محفل پہ ہاتھ میرا ہر دم
میں تاجرِ شعر ہوں ادا کارِ سخن
سب سے اعلیٰ مرا "چنا جھور گرم"

ترقی پسند اسکول

حضرت آزاد نظم:-

آزاد ہے نظم میری مانندِ خیال
لے دل کی کہاں، کہاں عروضی سم تال
جی میں ہے اڑوں میں مثلِ طیارہ مگر
لڑھیا سے مری ادب کی راہیں پامال

حضرت خام:-

مبہم ہو زباں خلوصِ احساس تو ہے
ترشا نہ سہی نہو یہ الماس تو ہے
آزاد تو فکر ہے نہو حسنِ بیاں
گو شعر نہیں شعر کی بو باس تو ہے

حضرت افادی:-

یہ حسن و محبت اک فسانہ ہے فقط
دنیا کی حقیقت آب و دانہ ہے فقط
ہوگا یہ آبشار سامانِ نشاط
میرے لئے بجلی کا خزانہ ہے فقط

حضرتِ عریاں :-

سرکے ہوئے آنچلوں سے پھٹتی ہوئی پو — بھیگی ہوئی ساریوں سے اُٹھتی ہوئی لو
جلتی ہوئی سانسوں کی مہکتی سی پھوار — ہر شعر مرا طلا کا اک نسخۂ نو

حضرتِ نعرہ خواں :-

ہے خون و عرق کی میرے شعروں میں مہک — جلوہ تو ہے کم سوا ہے شعلہ کی لپک
میرے نغموں کی زیرِ لب دھیمی نوا — سننے نہیں دیتی مرے پیروں کی دھمک

حضرتِ انقلابی :-

اک ابرِ سیاہ ہے سواری میری — برق و طوفاں پہ شہریاری میری
اک قطرۂ آب بھی نہیں مجھ میں تو کیا — ہے کشتِ ادب پہ ژالہ باری میری

حضرتِ اشتراکی :-

نکلی ہر پھانس سُرخ جھنڈے کے تلے — امرت ہر سانس سُرخ جھنڈے کے تلے
پھر دشتِ ادب کو کر رہا ہوں گلزار — دے دے کے ہیں پانس سُرخ جھنڈے کے تلے

شاعرِ حقیقی

حضرتِ شاعر:-

عمرِ گزراں کا میرے ہونٹوں پہ سرود میرے اشعار ہیں کہ بہتی ہوئی رود
طفلِ انساں کا دوست، ہمدرد، مشیر راحت ہیں نوید، غم میں تسکین کی گود

سامعین:-

ہر شعر پہ اپنے سر کو دھننے والے ہر خار کو گل سمجھ کے چننے والے
خوش ذوقیِ اہلِ بزم ما شاء اللہ پڑھنے والے وہ اور یہ سننے والے

نومبر ۱۹۴۷ء

۱۹۳۸ء

غزلیات

(۱)

ترا لطف آتشِ شوق کو حدِ زندگی سے بڑھا نہ دے
کہیں بجھ نہ جائے چراغ ہی اسے دیکھ آہنی ہوا نہ دے

ترا غم ہے دولتِ دل تری، اسے آنسوؤں میں لٹا نہ دے
وہی آہ نقدِ حیات ہے جسے لب پہ لاکے گنوا نہ دے

مری زندگی کی حقیقتوں کو نہ پوچھ اور میں کیا کہوں
مرا دوست آج وہی ہے جو مجھے زندگی کی دعا نہ دے

یہی زندگی نے سبق دیا کہ کبھی فریبِ کرم نہ کھا
یہ امید رکھ نہ کسی سے تو کہ مٹا سکے تو مٹا نہ دے

مجھے غم ہی دے جو نہ دے خوشی نہ کرم سہی تو ستم سہی
مگر اتنا کم بھی کرم نہ ہو کہ ترا ستم بھی مزا نہ دے

مرے دل کی خود یہ مجال تھی کہ وہ شامِ غم کو سحر کرے
تری یاد آ کے گھڑی گھڑی اگر آنسوؤں کو ہنسا نہ دے

ترے دل پہ حق ہے جہاں کا بھی یہ فرارِ عشق روا نہیں
غمِ دوست خوب ہے جب تلک غمِ زندگی کو بھلا نہ دے

وہ خدائے حسن ہی کیوں نہ ہو کوئی شے ہے غیرتِ عشق بھی
جو تری صدا پہ کھلے نہ در وہ کھلے بھی جب تو صدا نہ دے

مرے دشمنوں کے لبوں پہ تھی جو ہنسی وہ ملا اب اڑ چلی
انھیں ڈر ہے اب یہی غم مرا مری زندگی کو ہنسا نہ دے

اگست ۱۹۴۸ء

(۲)

زہرِ غم ہنس ہنس کے پینا آگیا
ہاں مگر دانتوں پسینا آگیا

کینہ جو کا وار ہے پھر کامیاب
تیرے دل میں بھی جو کینا آگیا

دے رہا ہے آنکھ میں آنسو بہار
جیسے خاتم پر نگینا آگیا

مجھ سے غفلت اور سب سے ہنس کے بات
دل رہائی کا قرینا آگیا

ہونے پائی تھیں ابھی آنکھیں نہ خشک
اک نئے غم کا مہینا آگیا

بحرِ غم بھی مرحبا اے مشقِ چشم
قطرہ قطرہ کرکے پینا آگیا

پھر چلی بادِ موافق بھی تو کیا
جب کنارے پر سفینا آگیا

تھم ذرا اے خشت باریِ خرد
زد پہ دل کا آبگینا آگیا

وار کیوں تیار ہے کیا پھر کوئی
بزمِ نابینا میں بینا آگیا

غم پہ غم اور قہقہوں پر قہقہے
آگیا ملاؔ کو جینا آگیا

اکتوبر ۱۹۴۸ء

(۳)

مرے دل میں ہے تو وہ روشنی کہ جو ظلمتوں کو سنوار دے

مگر اپنی فرصتِ تاب و تب بھی مذاقِ لیل و نہار دے

کسی برگِ زرد کا ذکر کیا مری آنکھ میں ہے وہ جوشِ گُل

مرے دشمنوں کی خزاں کو بھی جو نویدِ ابرِ بہار دے

سپرِ الم کے ہیں مورچے ابھی ہر محاذِ حیات پر

مجھے ہے یقینِ خوشی مگر، مجھے زک پہ زک یہ ہزار دے

انھیں ظلمتوں میں کہیں نہاں ہیں نشاطِ صبح کی چوٹیاں

کوئی غم کی وادیِ شام میں مرا نام لے کے پکار دے

کسی موجِ یاس میں ڈوبنا نہ تو یہ جنوں ہے نہ یہ خرد

نہ یہ کیفِ عہدِ حیات دے نہ سکونِ مرگ کنار دے

یہ خزاں بدوش سموم تو ہے گلوں کے ظرف کا امتحاں

وہی گل ہے گل جو فسردہ ہو تو فسردگی بھی بہار دے

کسی آسماں پہ ارم لیے کوئی منتظر ہے تو مجھ کو کیا

وہ مرا خدا ہے جو خُلد کو اسی خاکداں پہ اُتار دے

ابھی غم نصیبِ حیات ہے ترے بس میں پھر بھی یہ بات ہے
اسے اپنے غم میں گزار دے کہ جہاں کے غم میں گزار دے

کسے عذر اس میں کہ ہوش پر ہو بنا رواقِ حیات کی
اسے دے ستونِ خرد مگر اسے دل کے نقش و نگار دے

یہ سحابِ غارت و قتل و خوں یہ ہوائے نفرت و خوف و شک
یہی فصل گل ہے؟ نہیں نہیں! مجھے لا کے میری بہار دے

ترے آنسوؤں کی تجلیاں کہیں مل نہ جائیں یونہیں نہوں فنا
انھیں عرشِ چشم سے توڑ کر کسی آسماں پہ اتار دے

اکتوبر ۱۹۴۸ء

دوسرا رُخ

سیاہیوں کی تہوں میں شعاعِ آب بھی دیکھ
سحاب دیکھنے والے پسِ سحاب بھی دیکھ

فضا کا تیرگیِ نیم شب سے کر نہ قیاس
اُفق کی گود میں ننھا سا آفتاب بھی دیکھ

غروبِ مہر پہ رو رو کے کر نہ آنکھیں سُرخ
طلوعِ ذرّۂ خاکی کی آب و تاب بھی دیکھ

جمالِ سرو سے سینکے گا کب تلک آنکھیں
بہارِ سبزۂ پامال کا شباب بھی دیکھ

حقوقِ باغ پہ کب تک اجارۂ گل و برگ
نسیمِ صبح سے کانٹوں کو فیضیاب بھی دیکھ

شکستِ انجمنِ چرخ کا نہ کر ماتم
اُگل رہی ہے جو مٹّی وہ آفتاب بھی دیکھ

اسیرِ پنجۂ شاہیں میں کب تلک کنجشک
شکستِ بال و پرِ بازوئے عقاب بھی دیکھ

سُنا کلامِ خدایانِ دو جہاں تو بہت
اب اس پہ بندوں کی اصلاح کامیاب بھی دیکھ

فسردہ ہوتے ہوئے گل جو ہیں نظر میں تری
تو شاخِ خار پہ کھلتے ہوئے گلاب بھی دیکھ

نہ دیکھ صرف زر و سیم ہی کا چہرۂ فق
جبینِ مس پہ دمکتی ہے جو وہ تاب بھی دیکھ

فسانے پڑھ چکا شاہوں کے اب اُلٹ کے ورق
حدیثِ دہر میں ابنِ بشر کا باب بھی دیکھ

قسم ہے ضربتِ شمشیرِ خسروی کی تجھے
کہ آج تیشۂ مزدور کا جواب بھی دیکھ

اک انہدام تو ظاہر ہے ہر تغیر میں
جو دیدہ ور ہے تو تعمیرِ انقلاب بھی دیکھ

حقیقتوں سے ملانا نظر تو کچھ بھی نہیں
ملا کے آنکھ مزاجِ بہ کوئی خواب بھی دیکھ

فروری ۱۹۴۸ء

مہاتما گاندھی کا قتل

مشرق کا دیا گُل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سُن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لَو تھرّاتی ہے

اُتّر دکھن، پورب پچھم، ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے
نوعِ انساں شانوں پہ لیے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے

آکاش کے تارے بجھتے ہیں، دھرتی سے دھواں سا اُٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایا اُٹھتا ہے

کچھ دیر کو نبضِ عالم بھی چلتے چلتے رُک جاتی ہے
ہر ملک کا پرچم گرتا ہے ہر قوم کو ہچکی آتی ہے

تہذیبِ جہاں تھرّاتی ہے، تاریخِ بشر شرماتی ہے
موت اپنے کیے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے

انسان وہ اُٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقّاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی

دیکھا نہیں جاتا آنکھوں سے یہ منظرِ عبرت ناکِ وطن
پھولوں کے لہو کے پیاسے ہیں اپنے ہی خس و خاشاکِ وطن
ہاتھوں سے بجھایا خود اپنے وہ شعلۂ روحِ پاکِ وطن
داغ اس سے سیہ تر کوئی نہیں دامن پہ ترے اے خاکِ وطن

پیغامِ اجل لائی اپنے اس سب سے بڑے محسن کے لئے
اے والے طلوعِ آزادی! آزاد ہوئے اس دن کے لئے

جب ناخنِ حکمت ہی ٹوٹے دشوار کو آساں کون کرے
جب خشک ہوا ابرِ باراں ہی شاخوں کو گل افشاں کون کرے
جب شعلۂ مینا سرد ہو خود جاموں کو فروزاں کون کرے
جب سورج ہی گل ہو جائے تاروں میں چراغاں کون کرے

ناشاد وطن! افسوس تری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

اس حسن سے کچھ ہستی میں تری اضداد ہوئے تھے آ کے بہم
اک خواب و حقیقت کا سنگم مٹی پہ قدم نظروں میں ارم

اک جسمِ نحیف و زار مگر اک عزمِ جوان و مستحکم
چشمِ بینا، معصوم کا دل، خورشید نفس، ذوقِ شبنم
وہ عجز غرورِ سلطاں بھی جن کے آگے جھک جاتا تھا
وہ موم کہ جس سے ٹکرا کر لوہے کو پسینہ آتا تھا
سینہ میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اُس گل کی لطافت کیا کہیے
جو زہر پیے امرت کر کے اُس لب کی حلاوت کیا کہیے
جس سانس سے دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہیے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہیے
یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پر رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات
یکساں نزدیک و دور پہ تھا بارانِ فیضِ عام ترا
ہر دشت و چمن، ہر کوہ و دمن میں گونجا ہے پیغام ترا
ہر خشک و ترِ ہستی پہ رقم ہے خطِّ جلی میں نام ترا
ہر ذرّہ میں تیرا معبد، ہر قطرہ تیرتھ دھام ترا

اس لطف و کرم کے آئین میں مر کر بھی نہ کچھ ترمیم ہوئی
اس ملک کے کونے کونے میں مٹی بھی تری تقسیم ہوئی
تاریخ میں قوموں کی ابھرے کیسے کیسے ممتاز بشر
کچھ ملکِ زمیں کے تخت نشیں کچھ تختِ فلک کے تاج بسر
اپنوں کے لئے جام وصہبا اوروں کے لئے شمشیر و تبر
نردِ انساں پٹتی ہی رہی دنیا کی بساطِ طاقت پر
مخلوقِ خدا کی بن کے سپر میداں میں دلاور ایک توہی
ایماں کے پیمبر آئے بہت انساں کا پیمبر ایک توہی
بازوئے خرد اڑ اڑ کے تھکے تیری رفعت تک جا نہ سکے
ذہنوں کی تجلی کام آئی خاکے بھی ترے ہاتھ آنہ سکے
الفاظ و معانی ختم ہوئے عنواں بھی ترا اپنا نہ سکے
نظروں کے کنول جل جل کے بجھے پرچھائیں بھی تیری پا نہ سکے
ہر علم و یقیں سے بالاتر تو ہے وہ سپہر تابندہ
صوفی کی جہاں نیچی ہے نظر، شاعر کا تصور شرمندہ

پستیِ سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ اُلفت دی
قاتل کو بھی گو لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دُعائے رحمت دی

'ہنسا' کو 'اہنسا' کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک "پریم سندیسہ" لایا تھا
اس "پریم سندیسے" کو تیرے سینوں کی امانت بننا ہے
سینوں سے کدورت دھونے کو اک موجِ ندامت بننا ہے
اس موج کو بڑھتے بڑھتے پھر سیلابِ محبت بننا ہے
اس سیلِ رواں کے دھارے کو اس ملک کی قسمت بننا ہے

جب تک نہ بہے گا یہ دھارا شاداب نہ ہوگا باغ ترا
اے خاکِ وطن دامن سے ترے دُھلنے کا نہیں یہ داغ ترا
جاتے جاتے بھی تو ہم کو اک زیست کا عنواں دے کے گیا
بجھتی ہوئی شمعِ محفل کو پھر شعلۂ رقصاں دے کے گیا

بھٹکے ہوئے گام انساں کو پھر جادۂ انساں دے کے گیا
ہر ساحلِ ظلمت کو اپنا مینارِ درخشاں دے کے گیا
تو چُپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری

مارچ ۱۹۴۸ء

میری شاعری

کچھ اپنی باتیں کچھ ذکرِ دوراں
کچھ اشک و شبنم کچھ برق و طوفاں

میرے خد و خال شعروں میں میرے
گاہے نہفتہ گاہے نمایاں

بکھری پڑی ہے ان وادیوں میں
میری حدیثِ عمرِ گریزاں

میری منازل اور میرے جادے
میرے چمن اور میرے بیاباں

میری خزاں اور میری بہاریں
میری شبِ غم میرے چراغاں

کچھ خواب ہنستے اور جگمگاتے
کچھ زندگی کے تاریک عنواں

آلودۂ خاک میری جبیں ہے
آنکھوں میں لیکن تارے درخشاں

مجھ کو خطاکار کہہ لے زمانہ
میری خطائیں ہیں میرا ایماں

اوروں سے پوچھو میں کیا بتاؤں
ہوں دودِ محفل یا شمعِ سوزاں

یوں دل کی دولت لٹا کے بانٹی
کچھ نذرِ خوباں کچھ نذرِ انساں

دسمبر ۱۹۳۸ء

سنہ ۱۹۳۹ء

غزلیات

(۱)

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا آئی سحر یا وقتِ شام آیا

زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا

اُٹھانا ہے جو پتھر رکھ کے سینہ پر وہ کام آیا
محبت میں تری ترکِ محبت کا مقام آیا

اسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گزشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

ذرا لو اور دل کی تیز کر سیلا سا یہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا

نظامِ میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے
ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا

ابھی تک صیدِ یزداں و صنم اولادِ آدم ہے
بشر انساں نہیں رہتا جہاں ایماں کا نام آیا

بہار آتے ہی خونریزی ہوئی وہ صحنِ گلشن میں
خجل کانٹے تھے یوں پھولوں کو جوشِ انتقام آیا

بُھلائے آبلہ پاؤں کو بیٹھے تھے چمن والے
گرجتی آندھیاں آئیں کہ صحرا کا سلام آیا

سحر کی حور کے کیا کیا نہ دیکھے خواب دنیا نے
مگر تعبیر جب ڈھونڈی وہی عفریتِ شام آیا

کبھی شاید اسی سے رنگ فردوسِ بشر پائے
ابھی تک تو لہو انساں کا شیطاں ہی کے کام آیا

مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایام رفتہ پر
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا

توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا

نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

برہمن آبِ گنگا، شیخ کوثر لے اڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا املا کا جام آیا

جنوری ۱۹۴۹ء

(۲)

غموں کا بھی آتا ہے اکثر زمانا
خوشی کا بجاتا ہوا شادیانا

نہیں کرنے والے ترا مسکرانا
محبت کو ہے اور اک تازیانا

اسی میں کدورت، اسی میں محبت
یہی دل قفس ہے، یہی آشیانا

تکلف، تکلم، تبسم، توجہ
مزے پر اب آنے لگا ہے فسانا

مگر شورِ ہستی میں گم ہو گیا وہ
مرے دل نے چھیڑا تو تھا اک ترانا

اُن آنکھوں نے دل کو بہت گدگدایا
ہمیں بھولے بیٹھے ہیں کچھ مسکرانا

متاعِ جہاں کی یہ تقسیم کب تک
اِسے خوشہ خوشہ اُسے دانا دانا

ہر اک منظرِ زیست بے کیف دھندلا
یہ کس موڑ پر آگیا ہے زمانا

محبت دھڑکتے دلوں کی زباں ہے
نگاہیں ملیں اور مرتب فسانا

بساطِ جہاں سے مٹے گا بھی آخر
کبھی دھوپ کا یہ کا یہ چار خانا

ہراساں ہے آج اپنی طاقت سے دنیا
کہیں بن نہ جائے خود اپنا نشانا

مرا کیشِ اُلفت بس اتنا ہے ملّا
کرم یاد رکھنا، ستم بھول جانا

جنوری ۱۹۴۵ء

(۲)

فقط اپنی صدا ہی کو نہ آوازِ جہاں سمجھو
حدودِ آشیاں ہی کو نہ صحنِ گلستاں سمجھو

تمہارے ذوق پر یہ منحصر ہے دیکھنے والو
اسے آنسو سمجھ لو یا اسی کو داستاں سمجھو

خروشِ بزم میں بھی سازِ دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو

محبت کرنے والو دیکھنا دھوکا نہ کھا جانا
توجہ کو تغافل سے بھی بڑھ کر امتحاں سمجھو

وفا کیشی بغاوت بن نہ جائے کب تلک آخر
قفس کو دل پہ پتھر رکھ کے اپنا آشیاں سمجھو

مری نظروں میں جو کچھ ہے ارے اسکو تو سچ مانو
مری باتوں کو تم چاہے مرا حسنِ بیاں سمجھو

فلک والو فلک پر رہ کے سمجھے ہو نہ سمجھو گے
زمیں کا درد کیا ہے آ کے زیرِ آسماں سمجھو

یہ دردِ جاوداں والا تصورِ عشق کا کب تک
غمِ ہستی میں اب اس کو نشاطِ ناگہاں سمجھو

کہیں تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹانا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

شعور و فکر کی ہے تربیت اور پختگی اس سے
الگ چلتے رہو لیکن مذاقِ کارواں سمجھو

سبب میری خموشی کا مجھی سے پوچھتے کیا ہو
خموشی کیا نہیں کہتی محبت کی زباں سمجھو

لبِ مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

فروری ۱۹۴۹ء

(۴)

جو سطحِ خاک سے اونچی نگاہ کر نہ سکے
وہ تیرہ بخت ستاروں میں راہ کر نہ سکے

دلوں میں خلق کے قول اُن کے راہ کر نہ سکے
جو اپنی زیست کو اپنا گواہ کر نہ سکے

انھیں خوشی کا بھی عرفاں نصیب ہو نہ سکا
جو زندگی کسی غم میں تباہ کر نہ سکے

نبردِ عشق کے آداب میں ہے شرط عجیب
کہ اس میں چوٹ جو کھائے وہ آہ کر نہ سکے

جمالِ حسن میں تھا اک جلالِ عفت بھی
گناہگار خیالِ گناہ کر نہ سکے

کمی ہوئی تری اُلفت میں اتنی ہم سے ضرور
کہ آڑ لے کے تبسم کی آہ کر نہ سکے

وہی نہ اشک کے قطروں میں ڈھل گئی ہو کہیں
جس التجا کو شریکِ نگاہ کر نہ سکے

نہیں تمیزِ گل و خار نسل و رنگ پہ کچھ
وہ خار ہے جو چمن سے نباہ کر نہ سکے

خبر نہیں کہ ہے کیا وجہِ پارسائی شیخ
گناہ ہو نہ سکا یا گناہ کر نہ سکے

وہ شعر شعر نہیں اور کچھ بھی ہو ملّا
دلوں میں تیر کی صورت جو راہ کر نہ سکے

مارچ ۱۹۴۹ء

(۵)

اب بے نیاز ہیں ترے جور و جفا سے ہم
آگے نکل گئے ہیں مقامِ فنا سے ہم

آفت بھی نہ کون ہو بچے کس بلا سے ہم؟
اب تک تو جی رہے ہیں تمہاری دعا سے ہم

اب وہ بھی اجنبی سے ہیں نا آشنا سے ہم
کس انتہا پہ آئے ہیں کس ابتدا سے ہم

اپنے رہِ ادب میں ہیں خود رہنما سے ہم
بچ کر گزر رہے ہیں ہر اک نقشِ پا سے ہم

اتنا مہیب لہجۂ انساں ہے ان دنوں
سہمے سے جا رہے ہیں خود اپنی صدا سے ہم

ہاں تم نے اعترافِ محبت نہیں کیا
نیچی کیے ہوئے ہیں نظر کیا حیا سے ہم؟

پھر بھی تری نقاب کو چلمن بنا دیا
کرتے اب اور کیا نگہِ نارسا سے ہم

پیشِ نظر ہے ایک گروہِ شکستہ پا
پوچھیں گے راہ اب نہ کسی رہنما سے ہم

ہنس لو جنونِ خاک پہ تم آج اہلِ چرخ
اک دن خدائی لیکے رہیں گے خدا سے ہم

ہر گام پر صدائے جرس ہو رہی ہے کم
شاید بھٹک چلے ہیں رہِ مدعا سے ہم

ملّا یہ اپنا مسلکِ فن ہے کہ رنگِ فکر
کچھ دیں فضائے دہر کو کچھ لیں فضا سے ہم

مارچ ۱۹۴۹ء

سروجنی نائڈو

چمن کا موجِ شمیم چمن سلام تجھے
گلوں کا روحِ گل و یاسمن سلام تجھے

(۱)

ترے سخن کے سنوارے ہوئے دماغوں کا
تری نظر کے جلائے ہوئے چراغوں کا
تری ہی یاد سے روشن جگر کے داغوں کا
فروغِ گمشدۂ انجمن سلام تجھے

(۲)

اڑا کے لے گئے تارے ترے حسیں نغمے
ترے گدازِ جگر کے وہ آتشیں نغمے
سنے گی ایسے کہاں اب یہ سرزمیں نغمے
سرودِ رفتۂ سازِ وطن سلام تجھے

(۳)

نظر میں مرہمِ زخمِ جگر چھپائے ہوئے
سیاہیوں کو تبسّم سے جگمگائے ہوئے
کدورتوں میں محبت کی لَے بڑھائے ہوئے
دیارِ تلخ کی شیریں دہن سلام تجھے

(۴)

خزاں کی فصل میں بھی نکہتِ بہار رہی
وطن کے دورِ جنوں میں بھی ہوشیار رہی
خروشِ بزم میں بھی تو ترانہ بار رہی
جہنّموں میں نسیمِ عدن سلام تجھے

(۵)

نگاہ و دل تھے محبت سے سر بسر معمور
طہارتِ نفس آلائشوں سے کوسوں دور
جو نام کو بھی نہیں شعلہ خود وہ خالص نور
طلوعِ صبح کی سیمیں کرن سلام تجھے

(۶)

جمالِ شمع بھی پروانہ کا گداز بھی تھی
ادائے ناز میں کیفیتِ نیاز بھی تھی
ادب کی جان تھی خود اور ادب نواز بھی تھی
سخن طراز عروسِ سخن سلام تجھے

(۷)

جہاں ملی ہے حدِ کعبہ و صنم خانہ
جہاں پہ ختم ہے ہر تفرقہ کا افسانہ
وہاں تھی تو مترنّم دلوں کی سلطانہ
زبانِ شیخ و لبِ برہمن سلام تجھے

(۸)

خیال و فکر کی دنیا تری اسیرِ کمند
صفِ حیات میں انسانیت کا قدّ بلند
نبات لب میں سموئے سبھی شرق و غرب کے قند
شکر فروشِ جدید و کہن سلام تجھے

(۹)

غرورِ قومیت و دین کے کوہساروں میں
نفاقِ نسل و تمدّن کے ریگزاروں میں
الگ الگ سے حیاتِ جہاں کے دھاروں میں
ترانۂ دلِ گنگ و جمن سلام تجھے

(۱۰)

نئے پیامِ وطن کو نئے رسول ملے
نئی نظر، نئے مقصد نئے اصول ملے
ہر ایک کیاری سے گلشن کو اپنے پھول ملے
وطن کے تاج کے "لعلِ دکن" سلام تجھے
چمن کا موجِ شمیم چمن سلام تجھے
گلوں کا رشکِ گلِ یاسمن سلام تجھے

اپریل ۱۹۴۹ء

ارتقا

اہلِ دل بڑھتے رہے اور تیر چلتے ہی رہے
طور جلتے ہی رہے موسیٰ نکلتے ہی رہے

آہنی پنجۂ ستم کا منھ دباتا ہی رہا
سینۂ انساں میں کچھ نغمے مچلتے ہی رہے

باغ پر ٹوٹا ہی کیں گھر گھر کے کالی آندھیاں
چھپکے پھولوں میں دیئے شبنم کے جلتے ہی رہے

زندگی دیتی رہی گو ہر نفس پیغامِ مرگ
پھر بھی کچھ شوریدہ سر خوابوں پہ پلتے ہی رہے

اوپر اوپر سل پہ سل رکھتے گئے احکامِ جبر
تہ بہ تہ سوتے بغاوت کے اُبلتے ہی رہے

دیر تک رہتی نہیں اک جام میں صہبائے زیست
اس میں وہ تندی ہے پیمانے پگھلتے ہی رہے

شاخِ گل کے زخم بھرتا ہی رہا جوشِ نمو
اور گلچیں توڑ کر کلیاں مسلتے ہی رہے

لاکھ چاہا اہل طاقت نے کہ جم جائیں قدم
زندگی کے ڈھال پر لیکن پھسلتے ہی رہے

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے

حرفِ آخر بن کے اُترا ہر نیا آئینِ دہر
پھر بھی بانیٔ سیاست کے عنواں بدلتے ہی رہے

ارتقاء کی راہ میں رُکنا ہی ہے انساں کی موت
ہیں وہی زندہ جو اس رستے پہ چلتے ہی رہے

مل سکی جن کو نہ اس دنیا میں جا علاوہ خواب
اشک بن کر دیدۂ شاعر میں ڈھلتے ہی رہے

مئی ۱۹۴۹ء

جادۂ امن

لیے نویدِ امن و مژدۂ اماں بڑھے چلو
عَلَم لیے شہیدِ قوم کا نشاں بڑھے چلو

جو خستہ پا وطن کو پھر خرامِ امن دے گیا
تھکی فسردہ لب صفوں کو جامِ امن دے گیا
فسادِ کائنات کو نظامِ امن دے گیا
ہر اک محاذِ جنگ کو سلامِ امن دے گیا

اُسی کے نقشِ پا پہ اہلِ کارواں بڑھے چلو

عَلَم لیے ——————

ابھی تو تیلیوں سے ہے قفس کی سازِ آشیاں
ابھی تو اس جہاں پہ ہے خدائے جبر حکمراں
بشر کے واسطے نہیں کوئی بھی گوشۂ اماں
ہر اک طرف ہیں ظلمتیں، ہر ایک سمت ہے دھواں

دھوئیں میں لپکے اُس کی شمعِ ضو فشاں بڑھے چلو

عَلَم کیے ــــــــــــــ

لہو سے ہیں حدیثِ زندگی کی سُرخیاں ابھی
بٹا ہوا ہے جنگجو صفوں میں یہ جہاں ابھی
زمیں کی فوج ہے ابھی سپاہِ آسماں ابھی
حسیں اُفقِ حیات کا نظر سے ہے نہاں ابھی

کہیں تو خاک سے ملے گا آسماں بڑھے چلو

عَلَم کیے ــــــــــــــ

بدل بدل کے رنگ اُبھر رہا ہے فتنۂ جہاں
فن و ادب کو بھی پنہائی جا رہی ہیں وردیاں
گرج رہی ہیں بدلیاں، کڑک رہی ہیں بجلیاں
اِدھر سیاہ آندھیاں اُدھر ہیں سُرخ آندھیاں

ان آندھیوں کے درمیاں ہی درمیاں بڑھے چلو

عَلَم کیے ــــــــــــــ

بشر ابھی اسیرِ دامِ دین و نسل و رنگ ہے
ابھی تو حل ہر اک نزاعِ زندگی کا جنگ ہے
قدِ حیات پر ابھی قبائے امن تنگ ہے
ابھی صدائے دوستی پہ ہر طرف سے سنگ ہے
ابھی خصومتیں دلوں میں ہیں جواں بڑھے چلو
علم کیے ———————

ابھی مذاقِ جبر کی وہی ہیں چیرہ دستیاں
وہی غرض کے طاق ہیں وہی ہوس پرستیاں
وہی نشہ غرور کا وہی سیاہ مستیاں
ابھی تو گرد و پیش وپس ہیں پستیاں ہی پستیاں
نہاں انھیں میں نور کی ہیں چوٹیاں بڑھے چلو
علم کیے ———————

ابھی ابھی تو تم کھڑے ہوئے ہو اپنے پیر پر
ابھی تو راہ سخت ہے ابھی ہے دور کا سفر

نگاہِ پاک ہیں وہمتِ جواں رہی اگر
تمہیں بنو گے میرِ کاروانِ ایشیا۔ مگر
ابھی تو گردِ کارواں کا ہے گماں بڑھے چلو
علَم کیے ___________

مفادِ عام پر ہر ایک گام تولتے ہوئے
شبِ حیات میں سحر کا رنگ گھولتے ہوئے
جہنموں پہ خُلد کے دریچے کھولتے ہوئے
بشر کے آنسوؤں کو برگِ گل سے رولتے ہوئے
مسرتوں سے پاٹتے غمِ جہاں بڑھے چلو
علَم کیے ___________

جہانِ مردہ میں پھر ایک روح ڈالتے چلو
سموم کو نسیمِ جاں فزا میں ڈھالتے چلو
دلوں کے زنگ خوردہ آئینے اُجالتے چلو
ہر ایک نقشِ پا سے اک چراغ بالتے چلو

رہِ حیات کو بنا کے کہکشاں بڑھے چلو

علَم کیے ——————

فنا کے ریگزار میں بھی جوئے زندگی لیے

خروشِ عقل میں نوائے دل کی بانسری لیے

شبِ بلاکشاں میں چشمِ تر کی چاندنی لیے

دیارِ سنگ وخشت میں بھی گُل کی پنکھڑی لیے

غمِ جہاں میں چھیڑتے سرودِ جاں بڑھے چلو

علَم کیے ——————

وہ دیکھو دور سامنے ہیں زرنگار وادیاں

اک آخری سے موڑ پر ہے زندگی کا کارواں

نگاہِ کائنات میں ہیں پھر نئی تجلیاں

تبسمِ افق میں ہیں خموش کچھ کہانیاں

انھیں خموشیوں کو سونپتے زباں بڑھے چلو

علَم کیے ——————

لیے نویدِ امن و مژدۂ اماں بڑھے چلو

اگست ۱۹۴۹ء

رباعیات

رُباعیات

(۱)

یہ نور ترا ہے یا کہ ہے جامِ حیات
یہ تیری کرن ہے یا ہے پیغامِ حیات
خورشید سے کہہ رہی تھی شبنم دمِ صبح
تو میری حیات ہے کہ انجامِ حیات

(۲)

ویرانے میں پھر بنائے تعمیر سی ہے
پھر شوق میں اک نمو کی تاثیر سی ہے
تیرے قبضہ میں اے گزرتے ہوئے وقت
وہ کون سی چیز ہے جو اکسیر سی ہے

(۳)

کیوں اب وہ سرورِ بادہ و جام نہیں
کیوں صبح کو لطفِ محفلِ شام نہیں
کیا میرے جگر میں گرمیِ خوں وہ نہیں
یا تیری نظر میں اب وہ پیغام نہیں

(۴)

بلبل ہے ابھی تو زندگانی باقی
کیوں تیری نہیں وہ نغمہ خوانی باقی
مایوس نہ ہو ابھی جفائے گُل سے
ہے بادِ سحر کی خوش بیانی باقی

(۵)

جب اس کو کسی نے یہ خبر لا کر دی　　اللہ اللہ حسن کی بے دردی
شیریں کو یہ غم تو ہے کہ فرہاد مرا　　لیکن یہ خوشی سوا ہے جاں مجھ پر دی

(۶)

ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے ضرور　　پیارے اُلفت کا بھی یہی ہے دستور
گر گل کی مہک نہیں چمن میں باقی　　یہ اُس کی خطا نہیں خزاں کا ہے قصور

(۷)

پھر سوئے عدم چلے جہاں میں رہ کر　　آرام اُٹھا کے اور صدمے سہہ کر
ل شب کے لئے جما کے بزمِ ہستی　　سب سوگئے اپنے قصّے کہہ کر

(۸)

عشرت گہہِ صیاد کا ساماں لے کر　　گلچیں کے لئے دولتِ داماں لے کر
پھولو اکب تک بہار غیروں کے لئے　　غیرت ہے تو مٹ جاؤ گلستاں لے کر

(۹)

ب رددِ خیال ایک رُخ بہتی ہے　　اک رنگ پہ آرزو کہاں رہتی ہے
ہر سانس میں دل سے زیست کی نیرنگی　　افسانۂ شوق نو بہ نو کہتی ہے

(۱۰)

تریاق بنے گا نہ کبھی زہر کا جھاگ   کڑوے بولوں کی گونج چھیڑے گی نہ راگ
تلوار کے پانی سے بجھے گی نہ کبھی   نفرت کی ہواؤں کی لگائی ہوئی آگ

(۱۱)

ساقی! پھر غم کی ہیں سپاہیں تیار   لانا میری بھی ارغوانی تلوار
یہ حربۂ عیش دے مرے ہاتھ میں جلد   اب غم کی مجال ہو تو روکے مرے وار

(۱۲)

آنکھوں سے سبک حباب ٹپکیں نہ کہیں   نظریں ڈرتی ہیں ان کو چھو لیں نہ کہیں
تارے شبنم کے جیسے برگِ گل پر   انگلی لگتے ہی ٹوٹ جائیں نہ کہیں

(۱۳)

فن کی دیوی کو مسکراتے دیکھا   اک اور بلندی سے بلاتے دیکھا
پہونچا فن کار جب کسی چوٹی پر   زینہ اوپر کو اور جاتے دیکھا

(۱۴)

ملنا کتنا کوئی ملاقات نہیں   باتیں کیا کیا مگر کوئی بات نہیں
یارانِ جہاں کی دوستی کیا کہیے   ہونٹوں پہ گھٹا دلوں میں برسات نہیں

(۱۵)

ٹھکرا کے محبت کو نہ پچھتاؤ کہیں   معصومیت اچھی مگر اتنی بھی نہیں
بڑھ جائے نہ آگے کہیں ساقیِ حیات   تم جام لیے کے لیے رہ جاؤ یونہیں

(۱۶)

طائر چپ، گُل اداس سہمی سی نسیم   چھائی ہوئی اک مہیب خاموشیِ بیم
لپٹی جاتی ہیں پتیاں شاخوں سے   آنے والا ہے کوئی طوفانِ عظیم

(۱۷)

س سے بھی نہ مٹ سکے گی تاریکیِ غم   اس میں بھی تشدد کا وہی ہے دم خم
س لال سویرے میں بھی دنیا کے لئے   لالی ہے سوا سوا سویرا کم کم

(۱۸)

، دیوِ سماج خوں پیتا جائے   پی پی کے لہو دلوں کا جیتا جائے
نساں سے کہو منائے جشنِ نطرت   اور اس کے لئے کفن بھی سیتا جائے

(۱۹)

ِ مثلِ نسیم کوئی گلزار میں آئے   لچکیں کانٹے بھی یوں کہ سبزہ شرمائے
لمن جو چمن پہ آنکھ ڈالے کوئی   ہر برگِ گیاہ تن کے بھالا بن جائے

(۲۰)

قطرے مل مل کے بحرِ زخّار بنے ذرّے پاس آ کے قدِ کوہسار بنے
صدیاں گزریں بشر نہ لڑنے سے تھکا ہر صلح میں جنگِ نو کے ہتھیار بنے

(۲۱)

ہر دورِ کہن کی دورِ نو اک تجدید کب تک انساں فریبِ راحت کا شہید
تقدیرِ بشر کے باب کب تک یہی دو پہلے امید پھر شکستِ امید

(۲۲)

یوں اہلِ کمال وفن سے نا اہلِ ہنر ملتے ہیں اُبھر کے روشِ بد ذوقی پر
اترا اترا کے جیسے ٹیلے کی گھاس ڈالے سروِ چمن پہ جھک جھک کے نظر

(۲۳)

شمعیں گُل کر کے خوابِ راحت تو نہیں تاروں کو بجھا کے صبحِ عشرت تو نہیں
چڑھنے والے منارۂ ہستی پر پیروں کے تلے جہاں کی میت تو نہیں

(۲۴)

یہ تیرہ و تار غم کی راتیں کب تک خوابوں سے سجائے گا براتیں کب تک
گھر کی شمعوں سے اُٹھ چراغاں کر لے تاروں سے کیا کرے گا باتیں کب تک

(۲۵)

یہ سلطنتِ غیر مقامی کب تک   اے خاکِ افلاک کی یہ غلامی کب تک
اک بار تو اے حُبِّ زمیں جوش میں آ   اک ساکنِ گردوں کی سلامی کب تک

(۲۶)

یہ جذبہ قومیت ہے اصلی رہزن   انساں کا یہی ہے آج جانی دشمن
امنِ دُنیا کی بھولی سیتا کو کہیں   ہر لے نہ فریب دے کے پھر یہ راون

(۲۷)

پھولوں کے مزاج میں یہ دیکھا اکثر   کانٹوں پہ تو ان کی ہے عنایت کی نظر
سینہ میں کھٹک رہا ہے لیکن کیا کیا   اک دوسرے گُل کا حسن نشتر بن کر

(۲۸)

نازل ہوتی رہے گی یوں ہی یہ بلا   دنیا سے نہ جائے گی یہ جنگوں کی وبا
بزمِ انساں نہ ہو سکے گی ترتیب   جب تک بُتِ قوم کی ہے گھر گھر پوجا

(۲۹)

مزدور پہ سیٹھ جی بگڑ کر گرجے   محسن کُش ٹاٹ کے کمینے ٹکڑے
میں نے تو دی آستاں پہ اپنے تجھے جا   تونے تلووں میں میرے چھالے ڈالے

(۳۰)

ہر شب تری آغوش میں کی میں نے سحر   ہر اشک تبسم کی مرے تجھ کو خبر
تجھ سا کوئی محبوب وفادار نہیں   اک عمر کے ساتھی مرے پیارے بستر

(۳۱)

آزادی کی ہے آج بھی مجھ کو تلاش   یہ خواب بنے جلد حقیقت لے کاش
شاید ترے تیشے سے کچھ ابھریں خد و خال   پتھر ہے ابھی تو یہ صنم سنگ تراش

(۳۲)

معمارِ حیات کر نہ کچھ اس کا غم   ڈھانا ہی پڑے گا تجھ کو یہ قصرِ ستم
مسمار کیے بغیر جانے کا نہیں   بنیادِ غلط کا ہے جو تعمیر میں خم

(۳۳)

دل جیسے کہیں کچھ اور کہتے ہی نہیں   دھارے دنیا میں اور بہتے ہی نہیں
بس اپنی زبان و قوم و تہذیب کا راگ   انسان کہیں اور جیسے رہتے ہی نہیں

(۳۴)

منعم تھا نالشی حضورِ باری   اس بانٹ پہ بھی نہیں ہے مفلس راضی
لی میں نے فقط دو روزہ راحت مالک   اور اس کو غمِ دوام کی نعمت دی

(۳۵)

ہوجائے حیات کیوں لطافت سے نہ دور ۔۔۔ رنگین بہار، دل بجھے، ذہن ہیں چور
سونی بزمِ ادب تو ویراں رہِ عشق ۔۔۔ ہر جرعہِ زیست ہے بہ ظرفِ مزدور

(۳۶)

ڈھلتی ہوئی عمر آنکھ اٹھاتی ہے جدھر ۔۔۔ برچھی لگتی ہے جیسے اک سینہ پر
کیا کیا پچھلے پہر ستم ڈھاتی ہے ۔۔۔ اک شام کی یاد اور اک خوفِ سحر

(۳۷)

نظروں کو ملا کے مسکرا دو تو کہوں ۔۔۔ دل کو تھوڑا سا آسرا دو تو کہوں
ہونٹوں میں پھنسی ہوئی ہے کب سے اک بات ۔۔۔ ماتھے سے شکن ذرا ہٹا دو تو کہوں

(۳۸)

ویراں کشتِ حیات ہوتا ہی رہا ۔۔۔ لیکن میں دلوں میں پیار بوتا ہی رہا
طوفاں کی مہیب سیٹیوں کی لے میں ۔۔۔ ساحل کے ترانوں کو سموتا ہی رہا
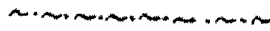
سوزِ ناتمام

مجھے سمجھ نہ کسی دیدۂ غریب کا اشک
جو لب تک آ نہ سکی ہے وہ التجا ہوں میں

موسمِ گل میں جو محرومِ لبِ رند رہے
آہ اُس جامِ لبالب کے مقدر کے لئے

ابرو و چشم و رُخ میں نہ مُو و کمر میں ہے
کہتے ہیں حُسن جس کو فریبِ نظر میں ہے

دل کہیں کامراں نہ ہو جائے
زندگی رائگاں نہ ہو جائے

وہ اک زمانہ کو اپنے ناز و ادا کے جلوے دکھا رہے ہیں
مری نظر سے جو لے گئے ہیں وہی خزانے لُٹا رہے ہیں

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

فردِ انساں کو انساں سے لڑوانے میں ــــــ اور کچھ بھی نہیں کعبہ میں نہ بتخانے میں
چشمِ رنگیں کی بہاریں بھی تصدق اس پر ــــــ وہ جو لذت سی ہو اک اشک کے پی جانے میں

جہاں میں مرد وہی ہے جو یہ شعار کرے ــــــ چھپائے غم کو مسرت کو آشکار کرے

نیازِ عشق کے آداب سے واقف مرا دل ہو ــــــ غنی ہے اور کیا کچھ مگر اندازِ سائل ہو

زیست کو زیست کی معراج پہ لانے کیلئے ــــــ غم ہے انسان کو انسان بنانے کیلئے
دے چکا میں تو تمہیں دل میں مقامِ محبوب ــــــ تم ہو کچھ اور تو وہ ہو گے زمانے کیلئے
حرفِ ارماں مرے دل نے بھی چنا ہے لیکن ــــــ لوحِ امید پہ لکھ لکھ کے مٹانے کیلئے

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کو ــــــ خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو اور خزاں میں نہیں

تاریک کتنی راتیں کتنی سیاہ گھڑیاں ــــــ غم میں ترے کٹی ہیں اشکوں کی چاندنی میں

چھڑی ہے جنگ صیادوں میں پھر تقسیم گلشن پر
نہ جانے کس کی کس کی آنکھ ہے اپنے نشیمن پر
کسی منظر پہ بھی وہ دل کشی آنے نہیں پاتی
قفس اپنا نہیں اک داغ ہے گلشن کے دامن پر

غضب ہے یوں کسی کا زیست سے بیزار ہو جانا
سمجھنا موت کیا ہے اور پھر تیار ہو جانا

آج دنیا سے اٹھانا کام وہ ملّا جسے
کامیابِ زیست بن جانا کوئی مشکل نہ تھا

میں اپنی خامیِ الفت پہ ہوں خجل کیا کیا
وہ یاد آئے تو ان کی جفا بھی یاد آئی

صیقلِ راحت سے اس کی آب ہو جاتی ہے کم
اک شعاعِ غم کے آتے ہی چمک اٹھتا ہے دل

اپنے دل کی صدا نہ سن پائے
اتنے اقوال دوسروں کے رٹے
اس نظر کا فریب کیا کہیئے
ماں کی چھاتی سے شیر خوار ہٹے

جوشِ تقسیم وارثوں کا نہ پوچھ   ضد یہ ہے ماں کی لاش کٹ کے بٹے

خیال سے تو گیا مجھ کو تا بہ رفعتِ شوق   مگر حیات تھی غدّار پھر ڈھکیل دیا

ہے رازِ نیازِ عشق یہی ٹوٹے نہ فریبِ حسن کبھی
لیلےٰ جو اٹھائے بھی پردہ نظروں کو لبِ محمل کر دے

مایوسیاں ہی جب زیست نہیں دنیا سے الگ جینا اچھا
جب بادۂ دل سم بن جائے تنہائی میں پینا اچھا

ہر سطحِ غم کو چیر کے دل میں اُتر گیا   یوں نشترِ حیات کہ ہنسنا پڑا مجھے

ستم پر ستم کر رہے ہیں وہ مجھ پر   مجھے شاید اپنا سمجھنے لگے ہیں

یوں دل بھی کہیں ہوتے ہیں جدا مُلّا کیسی نادانی   ہر رشتۂ ظاہر توڑ دیا زنجیرِ نہانی بھول گئے

نہ بن سکے گا نیا شوالہ جُڑیں گی ہرگز نہ دل کی اینٹیں
نظامِ حاضر کے سُرخ خوں کی پڑیں گی جبتک نہ گرم چھینٹیں

جن کے دل آزاد ہیں اُن سے قفس آباد ہیں
آج گلشن میں فقط ہم سے غلام آزاد ہیں

بلبلِ ناداں ذرا رنگِ چمن سے ہوشیار
پھول کی صورت بنائے سینکڑوں صیاد ہیں

آشیاں والوں کی اب گلشن میں گنجائش نہیں
آج صحنِ باغ میں یا صید یا صیاد ہیں

اپنی قوت آزما کر اپنے بازو تول کر
عرصۂ ہستی میں اڑنا ہے تو اُڑ پر کھول کر

تڑپنے کو تڑپ اے موجِ دریا جتنا جی چاہے
تجھے رہنا ہے لیکن عمر بھر آغوشِ ساحل میں

وسعتِ بزمِ جہاں میں ہم نہ مانیں گے کبھی
ایک ہی ساقی رہے اور ایک پیمانہ رہے

تڑپ اُٹھتا ہوں کوئی یادِ ہلپیٹیں جب دلاتا ہے
مری خاکسترِ دل میں ہیں کیسی بجلیاں باقی

یوں تم اس دل کے مالک ہو ہاں یاد رہے نیازک ہے
اک بار جو یہ ٹوٹا ٹوٹا پھر کھیل نہیں جو جوڑ دیا

موجزن دل میں رہے اچھا ہی جو کے آرزو
سینکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا ہو گئے

زاہد سے اس صنم کی نظر آج مل گئی
بنیاد ایک عمر کے تقویٰ کی ہل گئی
کیسا غبار چشمِ محبت میں آ گیا
ساری بہار حُسن کی مٹی میں رل گئی

اپنی جانب تیری نظروں کو مخاطب دکیا
راہ میں اپنی نہیں ہوتا ہے یوں کانٹے کوئی

یہ کہہ کے طور پہ بیہوش ہو گئے موسیٰ
مری حدیثِ تمنا ابھی تمام نہیں
ستم شعار زباں تک نہ آئے گی فریاد
مزاجِ عشق میں سودائے انتقام نہیں

دل دُکھے جس سے وہ ہنسی کیا ہے
جو رُلا دے وہ دل لگی کیا ہے
عشق ہے اب کسادِ بازاری
اک تجارت ہے دوستی کیا ہے

کیسے کیسے گلِ رعنا نگہِ شوق میں ہیں — نہ کہو قصۂ کوتاہی داماں ہم سے

جو اپنی موت سے دنیا میں کچھ کمی نہ ہوئی — تو زیست مستحقِ نامِ زندگی نہ ہوئی

ہنستے تھے زمانہ کو ہمدرد سمجھ کر ہم — اب اپنے عقیدہ پر ہنسنے کا زمانہ ہے

عشق کی دنیا میں قیدِ مذہب و ملت نہیں — کوئی پابندی بجز پابندیِ فطرت نہیں

وہ زیست کی بے کیف روانی تو نہیں ہے — خوں آگ ہے میرا تو ہو پانی تو نہیں ہے

مرتے دم میں ہوں پشیمانِ جہاں یہ منظور — میرے مالک مجھے کرنا نہ پشیمانِ وطن

تشدد کو تشدد سے دبالیں یہ تو ممکن ہے — مگر شعلہ کو شعلہ سے بجھایا جا نہیں سکتا

دکھا سکے گی نہ ہرگز جہاں کو امن کی راہ — ستمگری کی وہ مشعل جو دود سے ہے سیاہ

انساں کی جہالت کا ابھی ہے وہی معیار　　ہے سب سے سوا پختہ دلیل آج بھی تلوار

مقطع جب کسی کی شکلِ ایماں دیکھ لیتا ہوں　　اُٹھا کر طاق سے تصویرِ شیطاں دیکھ لیتا ہوں

اک جنوں الفت سہی اور حسن اک دھوکا سہی　　یہ سمجھ کر بھی جوانی کی مہم آساں نہیں

جل کے بھی اندھے پتنگوں کو نہ کچھ عقل آئی　　آج بھی شمع کی ہے گرمیِ بازار وہی

کبھی موجِ دریا نے مڑ کر نہ دیکھا　　سفینہ لگا کون تھک کر کنارے

زندگی یہ کہہ کے دی روزِ ازل اس نے مجھے　　یہ حقیقت غم کی ہے اور راحتوں کے خواب دیکھ

میں اب بھی منصبِ الفت کے اہل ہوں کہ نہیں　　عدو کو میں نے ترا نام لے کے پیار کیا

حریف بن کے مقابل میں آ سکا نہ جہاں　　تو دوست بن کے پسِ پشت آ کے وار کیا

محبت گرا یا ہی کی دل پہ پردے وہ خود آ گئے سامنے چھپتے چھپتے

نہ جانے کتنے دلوں کے چراغ گل کر کے تری نگاہ ستاروں کو نور دیتی ہے

میکدے پر نہیں کوئی موقوف دیر و کعبہ میں گل کھلے کیا کیا
خود تو جینے کی تاب لا نہ سکے اور دنیا سے ہیں گلے کیا کیا
کبھی ملا سے روٹھ کر سوچا اسکے دل میں بھی ہیں گلے کیا کیا

ہر راہ آ کے ختم ہوئی اس مقام پر یہ آستانِ عشقِ علیہ السلام ہے

تری جفا کو بھی سمجھا نگاہ در پردہ کہاں کہاں دل شیدا نے آسرا ڈھونڈا

محبت اک پیامِ مرگ اوروں کیلئے ہوگی مجھے تو زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے

خوشی کے سینکڑوں خاکے بنائے اہل دنیا نے مگر جب خدوخال ابھرے وہی تصویرِ غم آئی

رُخِ صنم خانہ تمتما یا شکن جبینِ حرم پہ آئی
اِدھر جہاں کے الم کدے میں کسی نے راحت کا خواب دیکھا

خلوصِ فن کا ہر فنکار سے پہلا تقاضا ہے
نظر اک دل کی جانب بھی ہو جب سوئے جہاں دیکھے
سہارا لے کے اپنے ذوق کا ملّا ہو دا را ہی
نہ ہو خود اعتمادی جس میں راہِ کارواں دیکھے

مرتے مرتے جی اُٹھے شاید کوئی
تم ملا کر آنکھ جامِ بھر تو دو

رفتہ رفتہ راہ پہ آجائیں گے
شیخ جی کو شربتِ کوثر تو دو

عشق کے کبتک یونہی دیکھو گے خواب
آؤ ملّا او کھلی میں سر تو دو

Printed at NAMI PRESS, LUCKNOW.1950